Regd. L. No.7243

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جولائی 1979

اس پرچہ میں :-

آرٹ اور اسلام

شائع کردہ: ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور ۹

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلی فون نمبر	بدلِ اشتراک
۳ تین روپے	۸۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور	سالانہ پاکستان -/۳۶ روپے غیر ممالک - ۳ پونڈ
شمارہ ۷	جولائی ۱۹۷۹ء	جلد ۳۲

فہرست

۱- آرٹ اور اسلام ----------- (محترم پرویز صاحب) ---------- ۲

۲- نقد و نظر ------------------ ۲۲

۳- قرآنی درس کے اعلانات وغیرہ --------- ۲۳

۴- "اسلام کا معاشی نظام" ---- (خطبۂ افتتاحیہ بتقریب مذاکرہ) ---------- ۲۵

(محترم غلام اسحٰق خانصاحب - وزیر مالیات پاکستان)

۵- حقائق و عبر --- (۱) مرتد کی سزا - (۲) زکوٰۃ کے متعلق - (۳) مصنوعی اتحاد کا مآل ------ ۴۲

(۴) قائدِ اعظمؒ کو گالی ---- (۵) طلوعِ اسلام کا اشتراکی نظریہ

۶- درِ منثور ---------- (از مکتوباتِ اقبالؒ) -------- ۵۱

۷- احتساب ---- (قسط ۷) ----------- ۵۷

۸- سلطان اورنگ زیب عالمگیر اور شرعی حدود کا نفاذ ----------- ۶۳

(پروفیسر رفیع اللہ شہاب)

ایڈیٹر محمد خلیل - ناشر سراج الحق - مقام اشاعت ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور - پرنٹر شیخ نیاز احمد - مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس ۱۷ ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آرٹ اور اسلام

پاکستان میں جوں جوں مذہبی پیشوائیت اپنے اصل روپ میں سامنے آتی جاتی ہے، نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ (ان کے پیش کردہ) مذہب سے برگشتہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ یہ فطرت کا پروگرام تھا کہ یہاں طلوعِ اسلام کا قرآنی مرکز پہلے سے قائم اور متعارف ہو گیا، اور اس مذہب گزیدہ طبقہ نے اس طرف کا رُخ کر لیا جہاں ان کے سامنے، خدا کا دین دلائل و براہین کی تائیدات اور علومِ عصرِ حاضر کی روشنی میں اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ وہ ان کے قلب و دماغ کے اطمینان کا موجب بن جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جس طرح دیگر ممالک میں ہوا، اور ہو رہا ہے، مذہب سے متنفر طبقہ یقیناً کمیونزم یا سیکولرزم کے آغوش میں چلا جاتا ؎

نکل کر دیر و کعبہ سے اگر ملتا نہ میخانہ　　تو ٹھکرائے ہوئے انساں خدا جانے کہاں جاتے

ان نوجوانوں کی طرف سے پیش کردہ اعتراضات کچھ تو انفرادی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ جن کا جواب انفرادی طور پر دے دیا جاتا ہے۔ اور کچھ ایسے جو کم و بیش اس پورے طبقہ کا اطمینان چاہتے ہیں۔ یہ جوابات ماہنامہ طلوعِ اسلام کی وساطت سے دیئے جا سکتے ہیں۔ چونکہ جناب پرویز کا، اوّلین مخاطب طبقہ، شروع ہی سے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا رہا ہے اس لئے وہ ان کے دل میں اُبھرنے والے اعتراضات اور سوالات کے متعلق بہت کچھ لکھ چکے ہیں ـــــ اتنا کچھ کہ اب شاید ہی کوئی ایسا سوال سامنے آتا ہو جس کا جواب ان کی تحریروں میں نہ مل جاتا ہو۔

اس طبقہ کی طرف سے پچھلے دنوں یہ سوال عام طور پر پوچھا گیا کہ اسلام میں آرٹ (موسیقی، مصوری، شاعری) کی پوزیشن کیا ہے؟ کیا یہ سب حرام ہیں یا ان سے محظوظ ہوا جا سکتا ہے؟ پرویز صاحب کا اس موضوع پر بھی ایک خطاب موجود ہے جسے انہوں نے طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۶۶ء میں پیش کیا تھا۔ ذیل میں اس خطاب کو (ان کی نظرِ ثانی کے بعد) پیشِ خدمتِ قارئین کیا جاتا ہے۔ طلوعِ اسلام۔

گلاب کے پھول کے متعلق کسی طبیب سے پوچھئے۔ وہ بتائے گا کہ اس کا مزاج حار و یابس ہے اور تاثیر کے اعتبار سے

ملین اور مدرر ۔ خواص کی طرف آئیے تو یہ مقوی اور مفرح قلب ہے اور جگر کی اصلاح میں بھی مدد دیتا ہے ۔ اس کے عرق اور گلقند کا شمار منفعت بخش ادویات میں ہوتا ہے ۔ فطرت نے اس میں بڑے فوائد رکھے ہیں ۔

لیکن یہی پھول جب ایک ایسے صاحبِ ذوق کی نگۂ حسن شناس کے سامنے آئے جسے فطرت نے حسِ لطیف سے نوازا ہو، تو اسے اس کے اندر، دلکش رعنائیوں اور کیف آور زیبائیوں کی ایک دنیا، مسکراتی، مچلتی، کھیلتی، ناچتی دکھائی دے گی ۔ اس کی نرم و نازک پتیوں کی لطافت ۔ اس کی شفق آمیز رنگینیوں کی نظافت اس کی نکہتِ جاں نواز کی عطر بیزیاں ۔ اس کی شگفتگی و شادابی کی مسرت خیزیاں، ہر چشمِ جمال آشنا کو یہ کہہ کر دعوتِ نظارہ دیں گی کہ

جمالیاتی پہلو

مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگِ تماشا را

اور کشش و جذب کا یہ عالم، پھولوں تک ہی محدود نہیں ۔ اس نگاہ سے دیکھئے تو صحنِ چمن کائنات کا ایک ایک گوشہ، دامانِ باغبان و کفِ گل فروش کا آئینہ دار نظر آئے گا ۔ یہاں کوئی شے ایسی نہیں دکھائی دے گی جس میں افادی پہلو (UTRITARIAN ASPECT) کے ساتھ جمالیاتی پہلو (AESTHETIC PHASE) موجود نہ ہو ۔ سورج کی نور پاشیوں میں، چاند کی ضیا باریوں میں، ستاروں کی مرصع کاری میں، کہکشاں کی روش نگاری میں، بادلوں کی سبک خرامی میں، نسیم سحر کی خوش پیامی میں، سمندر کی تلاطم خیز لہروں میں، ندی کی سکوت آمیز لویوں میں، سرو قامت درختوں کی پُرشکوہ صف آرائی میں، اور ان کی طرف لپک کر آنے والے پرندوں کی نغمہ سرائی میں، غرضیکہ نگار خانۂ کائنات کی کسی شے کو لیجئے، اس میں منفعت بخشی کے ساتھ ساتھ، جمال آفرینی، یوں سموئی ہوئی نظر آئے گی جیسے کسی خوابیدہ، محوِ خواب غنچے کے خاموش لبوں کی بہار آفریں مسکراہٹ ۔

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

حقیقت یہ ہے کہ خدا نے جب انسان کی پروردگاری (نشوونما ۔ ربوبیت) کا ذمہ لیا، تو ضروری تھا کہ اس کی زندگی کے ہر گوشے کے لئے سامانِ نشوونما مہیا کیا جاتا ۔ انسان کی ضروریات، طبعی ہی نہیں، جذباتی بھی ہیں اور اس کے جذباتی تقاضوں کی تسکین کے لئے ضروری تھا کہ اس کے لئے مہیا کردہ سامانِ نشوونما میں افادی اور جمالیاتی دونوں عنصر موجود ہوتے ۔ حیوان اور انسان میں ایک خطِ امتیاز یہ بھی ہے کہ حیوان کے تقاضے صرف طبعی ہوتے ہیں لیکن انسان کو ذوقِ جمالیات بھی ودیعت کیا گیا ہے ۔ ایک گائے کے نزدیک، پھول اور گھاس، یکساں چارہ اور شکم پُری کا سامان ہیں لیکن انسان ان دونوں میں تمیز کر سکتا ہے ۔ بشرطیکہ وہ حیوانی سطح سے ابھر کر، انسانی سطح پر آچکا ہو ۔

صدرنگِ ربوبیت

لیکن جس طرح انسان کی طبعی زندگی کے تقاضوں کی تسکین کے لئے چند قواعد و ضوابط کی ضرورت ہے ۔ اسی طرح اس کی جذباتی زندگی کے تقاضوں کے پورا کرنے کے لئے بھی حدود و قیود لاینفک ہیں ۔ خدا کی طرف سے عطا کردہ دین، وہ حدود و قیود متعین کرتا ہے جن کے اندر رہتے ہوئے انسان کی طبعی اور جذباتی زندگی کے تقاضے پورے کرنے سے، انسان کے جسم اور اس کی ذات، دونوں کی نشوونما ہوتی جاتی ہے اور اس طرح انسان اس دنیا میں بھی جنت بداماں زندگی بسر کرتا ہے، اور اس کے بعد کی زندگی

حدود و قیود

میں بھی، مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی، میں ذرا آگے چل کر بیان کروں گا۔

دین خدا کی طرف سے، حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے انسانوں کو ملتا رہا۔ لیکن انسانوں نے اس میں اپنے خیالات و نظریات کی آمیزش کر کے، اسے کچھ سے کچھ بنا دیا۔ دین کی اس مسخ شدہ صورت کو مذہب کہتے ہیں۔ اب دیکھئے کہ مذہب کی دنیا میں پہنچ کر، انسانی زندگی کے ان دونوں تقاضوں کے ساتھ کیا ہوا؟

مذہب کا تصوّر

مذہب کا بنیادی تصوّر یہ ہے کہ یہ دُنیا قابلِ نفرت ہے۔ یہاں کی ہر شے شر ہے۔ اس لئے خدا پرست انسان کو چاہیئے کہ وہ دنیا سے دور بھاگے۔ یہاں کی ہر شے سے نفرت کرے۔ وہ جس قدر مادی دنیا کے لذائذ و حظائظ سے قطع تعلق کرتا جائے گا اتنا ہی خدا کا مقرب بنتا جائے گا۔ حتیٰ کہ اگر اس کی کیفیت یہ ہو جائے کہ ان جاذبیتوں کے لئے اس کے دل میں خواہش تک بھی پیدا نہ ہو، تو اس کی مکمل نجات ہو جائے گی۔ یہ ظاہر ہے کہ جب تک انسان زندہ رہے گا اسے کھانے پینے کی چیزوں کی ضرورت لاحق رہے گی۔ اس سے اُسے مفر ہی نہیں۔ وہ انہیں کم کر سکتا ہے۔ لیکن ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہ جنگل میں چلا جائے۔ غاروں میں جا بسے۔ پہاڑ کی چوٹی پر آسن جما کر بیٹھ جائے۔ اسے کچھ نہ کچھ کھانے پینے کے لئے ضرور چاہیئے۔ اس لئے مذہب پرست لوگ، کھانے پینے کی چیزوں کو تو مطلق حرام قرار نہ دے سکے۔ البتہ جن عناصر کا تعلق انسان کے جذبات سے تھا ـــــ یعنی اشیائے کائنات کا جمالیاتی پہلو ـــــ انہوں نے ان کا گلا ضرور گھونٹ دیا۔ پھر اتنا ہی نہیں کہ یہ لوگ ان چیزوں سے مجتنب رہے ہوں۔ انہوں نے ایسی زندگی بسر کرنا "تقاضائے روحانیت" قرار دیا جو ہر

ان کے مقربین کی زندگی

صاحبِ ذوق کے نزدیک انتہائی قابلِ نفرت ہو۔ آپ ان کی روحانی دُنیا کے بڑے بڑے اکابر کے حالات پڑھئے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ نہایت گھناؤنے اور نفرت آگیں ماحول میں زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ عیسائیوں کے (SAINTS) ہوں یا ہندوؤں کے سنیاسی۔ وہ بدھوں کے بھکشو ہوں یا ارباب خانقاہیت، ان سب کی کیفیت ایسی ہی نظر آئے گی۔ کسی کے متعلق کہا جائے گا کہ اس نے ساری عمر غسل ہی نہیں کیا۔ فلاں نے عمر بھر نہ حجامت بنوائی نہ ناخن ترشوائے۔ کسی نے غلاظت کے ڈھیر اور دلدل میں زندگی گزار دی۔ کوئی ساری عمر کھلے آسمان کے نیچے بیٹھا رہا۔ کوئی کنوئیں میں لٹکا رہا۔ آپ اب بھی اپنے ہاں کسی "اللہ والے سائیں بابا ـــ" یا ان سے بھی اگلی منزل میں پہنچے ہوئے مجذوب کو دیکھئے۔ غلاظت و کثافت کی وجہ سے آپ کا ذوقِ سلیم ان کے قریب تک جانے سے ابا کرے گا، لیکن عقیدت مندوں کے ہجوم کو اسی مزبلہ میں جنت کی ہواؤں کی خوشبو آ رہی ہو گی۔ جو لوگ اس تفریط تک نہیں جاتے، ان کی شریعت بھی زیبائش و آرائش کی چیزوں کو حرام قرار دینے میں کسی سے پیچھے نہیں رہتی۔

اگرچہ مذہب کی دنیا بیشتر انہی لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جن کی نہ ذہنی سطح بلند ہوتی ہے اور نہ ہی جو ذوقِ لطیف سے بہرہ یاب ہوتے ہیں، لیکن ان گھرانوں میں ایسے لوگ بھی پیدا ہو جاتے ہیں جن

چور دروازے

میں یہ ذوق موجود ہوتا ہے۔ وہ اس کی تسکین کے لئے چور دروازے تراش لیتے ہیں مثلاً عیسائیوں کی شریعت اور طریقت، دونوں میں مادی دنیا قابلِ نفرت ہے۔ لیکن آپ روم کے بڑے بڑے عظیم الشان گرجوں کو دیکھئے۔ ان میں آپ کو مصوری اور مجسمہ تراشی کے نادر نمونے ملیں گے۔ جنت نگاہ کے لئے ان کی

خانقاہوں میں حسین و جمیل راہبات (NUNS) تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں جگمگاہٹ پیدا کر رہی ہوں گی۔ اور گرجے کی انتہائی نرم و نازک موسیقی ان کے لئے فردوسِ گوش بنے گی۔ یہی کیفیت ہندوؤں کے مندروں اور سنیاس آشرموں میں نظر آئے گی۔ مجسمے، تصویریں، کرشن، رادھا اور گوپیوں کے عشق و محبت کی ہیجان خیز داستانیں۔ اور انہی پر مشتمل ان کا سنگیت۔ رنگ و رامش کے یہ ہنگامے ان کے ہاں بھگوان کی پوجا اور آتما شکتی کے ذرائع ہیں۔ خود ہمارے ہاں تصوّف کے بیشتر خانوادوں میں بلند پایہ موسیقی ——— جس کا بشکل قوالی کی شکل میں کیا جاتا ہے۔ روحانی منازل طے کرنے کی سیڑھیاں قرار دی جاتی ہیں۔ جو اتنی دور تک نہیں جاتے، وہ مزامیر (سازوں) کے بغیر موسیقی پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ (گویا ایک ہی آواز جو انسان کے گلے سے نکلے وہ حلال لیکن وہ لوہے کے "تار" یا بانسری کے چھید سے نکلے تو حرام!) اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس قسم کی تفریق کو منسوب کیا جاتا ہے اس ذاتِ اقدس واعظم کی طرف جس میں حسنِ کائنات کی تمام جلوہ افروزیاں سمٹ کر آ گئی تھیں۔ حتیٰ کہ ہمارا زاہدِ خشک قرآن کریم کی جس قرأت پر وجد میں آ جاتا ہے، اس میں بھی موسیقی کی لَے، نئے ناشنیدہ کی طرح ارتعاش انگیز ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں حجازی اور مصری، دو قرأتیں زیادہ مقبول اور مروج ہیں۔ ان میں سے ایک بھیرویں راگ میں ہوتی ہے۔ اور دوسری بھیرویں میں۔ یہ سب اس لئے کہ ——— بجز اُن لوگوں کے جو اس ذوق سے یکسر محروم ہوں، یعنی جو انسانی سطح تک پہنچ نہ پائے ہوں ——— ذوقِ لطیف سینے میں انگڑائی ضرور لے گا۔ اگر آپ اس کی تسکین کا سامان کھلے بندوں نہیں کریں گے، تو وہ اپنے لئے زیرِ زمین سرنگیں کھود لے گا۔

پری رو تابِ مستوری ندارد   چوں در بندی ز روزن سر برآرد

یہ زیرِ زمین سرنگیں ——— یعنی ز روزن سر برآوردن ——— آج کل کی نفسیاتی اصطلاح میں ——— بدنہادی یعنی (PERVERSION) کہلاتی ہے۔ جس کا نتیجہ انسانی ذات کی نشوونما کی بجائے اس کی تخلیق (گلا گھونٹ دینا) اور تدفین ہوتا ہے۔ مذہب کی دنیا میں ہوتا ہی یہ ہے۔ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حقائق کا مقابلہ کرنا نہیں سکھاتا۔ وہ کنکھیوں سے دیکھنا سکھاتا ہے۔ وہ بظاہر صبح سے شام تک جذبات کی مخالفت میں سرگرمِ سخن رہتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ بہانہ ہوتا ہے انہی جذبات کو اپنے سینے میں متلاطم رکھنے اور ان سے ذہنی لذت حاصل کرنے کا۔ اس کی روش عجیب مضحکہ انگیز ہوتی ہے۔ وہ خدا کو عدیم النظیر صانعِ کائنات مانتا اور اس کی عظمت کے سامنے اپنا سرِ نیاز خم کرتا ہے، لیکن اُسی صانع کی عظیم صنعت گری، یعنی دنیا اور اس کی زیبائش و آرائش کی چیزوں کو قابلِ نفرت اور انسان کے جذبات و عواطف کو فنا کر دینے کے لائق قرار دیتا ہے اور اسے اپنی انتہائی خدا پرستی پر محمول کرتا ہے ——— صانع کی تعریف اور اس کی صنعت کی مذمت، یہ مذہب کی بارگاہ ہی میں ممکن ہے۔ اس کے برعکس دین، نہ دنیا کو قابلِ نفرت قرار دیتا ہے، نہ انسانی جذبات کو فنا کر دینے کے قابل۔ وہ انسان کی کسی صلاحیت کو نہ بجائے خویش خیر قرار دیتا ہے، نہ شر۔ ان کا استعمال انہیں خیر یا شر بنا دیتا ہے۔ آئیے ہم دیکھیں کہ قرآن کریم اس اجمال کی تفصیل کیا بیان کرتا ہے۔

ہمارے ہاں دو اصطلاحیں مروّج ہیں۔ جلال اور جمال۔ جلال میں قوت بھی شامل ہے اور ہر شے کا افادی پہلو بھی

کیونکہ افادی پہلو کا صحیح استعمال، قوت پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے۔ اس کا تعلق انسان کی طبیعی زندگی سے ہے۔ اس کے برعکس جمال، کسی شے کا تحسینی پہلو ہے۔ یعنی اس کی (APPRECIATIVE VALUE) اس کا تعلق

قرآنی تصوّر

انسان کے جذبات سے ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، مذہب کی دنیا، اشیائے کائنات کے جلالی (یا افادی) پہلو کو تو خدا کی طرف سے خیر قرار دیتی ہے، لیکن ان کے جمالیاتی پہلو کو جس کا تعلق انسان کے جذبات سے ہے، شر سمجھتی ہے۔ یہ ثنویت (DUALISM) درحقیقت، مجوسیوں کے ذہن کی پیدا کردہ ہے جن کے ہاں نیکی کا خدا اور ہے (یعنی یزداں) اور برائی کا خدا اور (یعنی اہرمن)۔ قرآن کریم نے آکر اعلان کیا کہ ثنویت کا یہ تصور یکسر باطل ہے۔ جلال اور جمال، دونوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے۔ یعنی خدائے واحد کی ذات۔ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ (۶۴/۱) قوت (اقتدار) اور حمد دونوں کا سرچشمہ اسی کی ذات ہے۔ کسی صانع کے نادر شاہکار کو دیکھنے سے، جذباتِ تحسین و آفرین کا ابھر کر، بے ساختہ زبان پر آجانا، حمد کہلاتا ہے۔ قرآن کریم میں، خدا کو بار بار حمید کہا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی حسن آفرینی محض اتفاقی یا ہنگامی نہیں۔ اس کا مظاہرہ التزاماً اور دواماً ہوتا رہتا ہے ؎

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز رہتا ہے آئینہ بھی دائم نقاب میں

آپ نے غور کیا ہوگا کہ قرآن مجید کی ابتداء اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سے ہوتی ہے۔ (۱/۱)۔ ربوبیت (پرورش اور نشوونما) سے اگر اشیائے کائنات کا افادی پہلو سامنے آتا ہے تو حمدیت سے ان کا جمالیاتی گوشہ بے نقاب ہوتا ہے۔ اسی لئے اس نے، خدا کی طرف جانے والے راستے کو صِرَاطَ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ کہا ہے (۱۴/۱) یعنی وہ راستہ جس پر چلنے سے، غلبہ اور قوت بھی حاصل ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی زندگی کے نرم و نازک گوشے بھی سنورتے اور نکھرتے چلے جاتے ہیں۔

خدا نے اپنے عملِ تخلیق کے متعلق کہا ہے :-

اَلَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ (۳۲/۷)

خدا وہ ہے جس نے ہر شے کو حسین ترین انداز میں پیدا کیا ہے۔

خدا کا عملِ تخلیق

حسن نام ہے صحیح صحیح توازن اور تناسب کا۔ جہاں کسی شے کے توازن و تناسب (PROPORTION) میں ذرا سا فرق آیا، اس کا حسن جاتا رہا۔ پیکاسو نے ٹھیک کہا تھا کہ اگر قلوپطرہ کی ناک ذرا چپٹی ہوتی تو دنیا کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ خدا نے اپنے عملِ تخلیق کے متعلق بڑی تحدی کے ساتھ کہا ہے کہ تم اس میں کہیں عدم توازن نہیں دیکھو گے۔ کسی شے کو غیر متناسب نہیں پاؤ گے۔ اس کے کہنے کا انداز ملاحظہ کیجئے۔ سورۃ الملک میں ہے مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ تم خدائے رحمٰن کی تخلیق (اشیائے کائنات) میں کہیں کوئی جھول۔ کوئی سلوٹ۔ کوئی شکن نہیں دیکھو گے۔ کہیں عدم تناسب نہیں پاؤ گے۔ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝ طائرِ نگاہ کے پر کھول کر اسے کائنات کی فضائے بسیط میں اڑانِ بال کشائی دو اور پھر اس سے پوچھو کہ کیا اسے کہیں کوئی سقم۔ کوئی عیب۔ کوئی شگاف کوئی بدنمائی دکھائی دی ہے ؟ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ۔ ایک بار نہیں۔ بار بار نگاہ سے کہو کہ وہ

اچھی طرح دیکھے۔ خوب تلاش اور تجسس کرے۔ يَنْقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ٥ (۶۷/۴) وہ خاسر اور درماندہ، ناکام اور مایوس کا شانۂ چشم میں لوٹ آئے گی۔ نگارخانۂ فطرت میں اسے کہیں کوئی سقم دکھائی نہیں دے گا۔

زیبائشِ ارضی

اب آگے بڑھئے۔ زمین سے انسان کے لئے سامانِ زیست پیدا ہوتا ہے، اس لئے اس کی حیثیت یکسر افادی نظر آتی ہے۔ لیکن خدا کا ارشاد ہے کہ إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا۔ (۱۸/۷) زمین پر جو کچھ بھی ہے اس میں ہم نے زینت و آرائش کا پہلو بھی رکھا ہے۔ دیکھو تو یہ اس قدر رنگارنگ کے حسین گہنے پہنے، کس قدر دلہن بنی نظر آتی ہے؟ ہم نے کارگہِ فطرت کو ایسا حسین و خوش رنگ کیوں بنایا ہے؟ لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا (۱۸/۷) تاکہ انسان بھی اپنی ذات میں اعتدال اور توازن پیدا کرکے، اپنے اعمال کو اسی طرح حسین و جمیل بنائے۔ قرطاسِ ارض پر حسن کی گلکاریاں اس امر کی محرک بنتی ہیں کہ انسان 'خود اپنی ذات' اور اپنے معاشرہ میں حسن پیدا کرے۔ یعنی اس کا توازن نہ بگڑنے دے۔ آپ نے غور نہیں کیا کہ قرآن نے "نیک عملی" کو حسنات (حسنِ عمل) کہہ کر پکارا ہے! یعنی وہی عمل 'مقبولِ بارگاہِ خداوندی' ہے جس میں حسن ہے۔

فضا کی آرائش

ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ قرآن کریم نے سطحِ ارض پر بچھی ہوئی بساط کی زینت و آرائش کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ اب نگاہ آسمان کی طرف اٹھایئے اور دیکھئے کہ اس مرصع چھت میں آپ کو کس قسم کی میناکاری نظر آتی ہے؟ قرآن اس کی شہادت دیتا ہے کہ چاند، سورج، ستارے، بڑے بڑے عظیم کُرّے ہیں جو فضا کی پہنائیوں میں مصروفِ گردش ہیں۔ لیکن وہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ (۶۷/۵) تم دیکھو کہ جو فضا سطحِ ارض سے قریب تر ہے اس میں تمہیں کس قدر حسین و جمیل شمعیں فروزاں نظر آتی ہیں۔ چونکہ ہم جانتے تھے کہ تمہیں ہر شب، سونے سے پہلے، آسمان کی طرف دیکھنا ہے' اس لئے ہم نہیں چاہتے تھے کہ تمہاری نگاہ اوپر کو اٹھے تو وہاں بڑے بڑے بھیانک کُرّے دکھائی دیں جس سے تمہاری نیند اچاٹ ہو جائے اور تمہارے بچے ڈر کے مارے سہم جائیں۔ ہم نے ایسا انتظام کر دیا کہ یہ بھیانک کُرّے تمہیں جگمگاتی قندیلیں نظر آئیں جو تمہارے لئے وجہ نورانیِ دل و دیدہ ہوں:۔ وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ۔ (۱۵/۱۶) فضائے آسمانی کے ان عظیم الجثہ کُرّوں کو ہم نے دیدۂ بینا کے لئے کیسا خوشنما بنا دیا؟

سورۂ نحل میں، افادی اور جمالیاتی پہلو، بڑے حسین انداز میں سامنے لائے گئے ہیں۔ پہلے کہا۔

مویشیوں کی دنیا

وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَأْكُلُوْنَ ٥ (۱۶/۵) تم مویشیوں کو دیکھو۔ ان میں تمہارے لئے کس قدر فائدے کی چیزیں ہیں۔ ان کی اون سے تم گرم کپڑے بناتے ہو۔ ان کا گوشت تمہارے کھانے کے کام آتا ہے۔ وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ إِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ إِلَّا بِشِقِّ الْأَنْفُسِ (۱۶/۷)۔ ان میں جو باربرداری کے کام آتے ہیں وہ تمہارا سامان اٹھا کر

دور دراز شہروں میں لے جاتے ہیں۔ اگر تمہیں یہ سامان خود اٹھانا پڑتا تو تم کس مصیبت میں پڑ جاتے؟ وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا۔ پھر تم گھوڑوں، خچروں اور گدھوں کو دیکھو۔ وہ تمہاری سواری کے کام آتے ہیں۔ وَزِينَةً (۱۶/۸) اور بعض ان میں سے تمہارے لئے سامانِ زینت بھی بنتے ہیں۔

یہاں تک آپ نے دیکھا کہ مویشیوں کے افادی پہلو کو ابھار کر سامنے لایا گیا ہے۔ اور جو کچھ کہا گیا ہے اس باب میں اس سے زیادہ اور کہا بھی کیا جا سکتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہ ان میں سے بعض کا دودھ بھی پیا جاتا ہے۔ اس کا ذکر بھی قرآن نے دوسری جگہ کر دیا ہے لیکن نہیں! ٹھہریئے اور دیکھئے کہ قرآن کریم ان کے متعلق اور کیا کہتا ہے؟

محاکات مناظر کشی، شاعری کی جان ہوتی ہے اور مصوری کی روح ـــــ ذرا چشمِ تصور سے دیکھئے کہ یہ الفاظ آپ کے سامنے کس قدر حسین و پُرکیف منظر پیش کرتے ہیں کہ ـــــ

ریت کے ٹیلے پہ وہ آہو کا بے پروا خرام

یا ـــــ گونجتی ہے جب فضائے دشت میں بانگِ رحیل ـــــ اس کے ساتھ ہی ـــــ

آگ بجھی ہوئی اِدھر، ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر

کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں!

یا ایک طرف ـــــ وہ نمودِ اخترِ سیماب پا ہنگامِ صبح ـــــ اور دوسری طرف،

وادیٔ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب

لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

ان میں سے ایک ایک منظر حسن کی چلتی پھرتی دنیا اپنے جلو میں لئے ہے۔

اب ذرا انہی آیات کی طرف پھر چلئے جن کا تذکرہ اوپر سے چلا آ رہا تھا۔ یعنی یہ کہ تمہارے لئے تمہارے مویشیوں میں کس قدر منفعت بخش چیزیں ہیں۔ یہ سب کچھ گنانے کے بعد کہا کہ ان میں اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہے لیکن اس "کچھ اور" کے دیکھنے کے لئے نگہ نظارہ جُو کی ضرورت ہے، کہ وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ (۱۶/۶)۔ ذرا چشمِ تصور سے دیکھو کہ علی الصبح تاروں کی چھاؤں میں، نور کے تڑکے، جب فضا کی آنکھیں ہنوز نیم خوابیدہ، نیم وا ہوتی ہیں، اور چاروں طرف سکوت کا عالم، اس وقت جب تم ان مویشیوں کو چوپال سے نکال کر، باہر چراگاہوں کی طرف لے جاتے ہو، تو یہ منظر کس قدر جمال آفریں ہوتا ہے۔

اور پھر شام کے وقت، جب سورج تھک کر، پہاڑ کی اوٹ میں سستانے چلا جاتا ہے۔ فضا پر چاروں طرف دھندلکا چھا جاتا ہے۔ کھیت اداس اور راستے خاموش ہو جاتے ہیں۔ تو اس وقت جب تم ان مویشیوں کے گلے کو چراگاہوں سے خراماں خراماں بستی کی طرف واپس لاتے ہو، تو یہ سماں بھی کس قدر کیف بار ہوتا ہے۔ وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ (۱۶/۶)۔ تمہاری نگاہیں ان کے افادی دائروں میں محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ لیکن اگر تمہارے سینے میں برف کی قاش نہیں، دھڑکنے والا دل ہے تو تم محسوس کرو گے کہ ان کے اس جمالیاتی پہلو کی کوئی قیمت ہی نہیں۔ یہ سب بے بہا ہیں۔

آپ نے مویشیوں کے اس طرح چراگاہوں کی طرف جانے اور واپس آنے کے مناظر کسی عظیم ترین مصور

کے نادر شاہکار میں دیکھے ہوں گے اور یا پھر قرآن کریم کے ان چند الفاظ میں۔ ذرا چشمِ تصور سے کام لیجئے اور دیکھئے کہ کیا ان الفاظ کے محاکاتی اعجاز کے سامنے ہر نگہِ جمال آشنا جھک نہیں جاتی؟

اطاعت سے زینت

اب آگے بڑھئے۔ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ مذاہب کی دُنیا میں تصور یہ ہے کہ جس قدر کوئی شخص خدا کی بندگی۔ پوجا، تپسیا، بھگتی، گیان دھیان میں آگے بڑھتا ہے اتنا ہی وہ دنیا اور اس کی زیبائش و آرائش سے دور ہٹتا چلا جاتا ہے۔ گویا خدا کا تقرب اور دنیاوی زیبائش و آرائش، ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔ زاہد کے لئے خشک ہونا ضروری ہے خواہ وہ کسی مذہب کا زاہد ہو۔ زہد کے معنی ہی بے رغبت ہونا ہیں۔ لیکن دیکھئے کہ قرآن کریم کا اس باب میں کیا ارشاد ہے۔ وہ کہتا ہے۔ یٰبَنِیٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ (۷/۳۱)۔ اے نوعِ انسان! یہ تصور غلط ہے کہ اطاعتِ خداوندی کے لئے ترکِ دنیا۔ ترکِ لذات، ترکِ زیبائش و آرائش ضروری ہے۔ یاد رکھو، دنیاوی زیب و زینت اطاعتِ خداوندی کی راہ میں حائل نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس، اس اطاعت سے خود زیب و زینت کے پہلو اُبھرتے ہیں کیونکہ اطاعتِ خداوندی کا لازمی نتیجہ اس دُنیا میں خوشگواریاں حاصل ہونا ہیں۔ اور اس کے بعد کی زندگی کی خوشگواریاں بھی۔

اور اس کے بعد قرآن کریم نے وہ اعلانِ عظیم کیا ہے جو اس باب میں قولِ فیصل کا حکم رکھتا ہے اور جس سے مذہب کی دنیا میں زلزلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اعلان یہ ہے کہ

> قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِیَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا خَالِصَةً یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ (۷/۳۲)۔ اے رسول! تم ان مذہب پرستوں سے پوچھو کہ وہ کون ہے جو اُن زیب و زینت کی چیزوں کو اور اشیائے خورد و نوش کو حرام ٹھہراتا ہے جسے اللہ نے اپنے بندوں کے استعمال کے لئے پیدا کیا ہے؟ یہ سامانِ زیب و زینت، اس دنیا کی زندگی میں (خدا کے طبیعی قانون کے مطابق) کافر و مومن ہر ایک کے لئے کھلا ہے۔ جس کا جی چاہے محنت اور ہمت سے اسے حاصل کر لے۔ لیکن اُخروی زندگی میں یہ صرف مومنین کے حصے میں آئے گا۔

آپ نے اندازہ فرمایا کہ کس قدر تحدی ہے اس اعلان میں کہ وہ کون ہے جو خدا کی پیدا کردہ اشیائے زیب و زینت کو لوگوں کے لئے حرام قرار دے دے؟ یہ تو خدا کے مقابل کھڑا ہو جانے کے مرادف ہوگا! اس لئے کہ خدا تو ان چیزوں کو لوگوں کے استعمال کے لئے پیدا کرتا ہے اور یہ، لوگوں سے کہتے ہیں کہ ان کے قریب نہ جانا۔ ان کا استعمال حرام ہے! یہ خدا کے مقابلہ میں خدا بن جانا نہیں تو اور کیا ہے؟

جنّت کی نعماء

خدا نے، اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نتیجہ جنّت بتایا ہے۔ اس دنیا میں بھی جنتی معاشرہ اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی جنّت۔ اس جنّت کی جو تفاصیل قرآن کریم میں آئی ہیں —— اس دنیا میں حقیقی معنوں میں اور اُخروی زندگی میں تمثیلی انداز سے جن کا بیان ہوا ہے ان پر غور

کیجئے اور دیکھئے کہ حسن و زیبائش کا کوئی گوشہ بھی ایسا ہے جو اس میں نہ آگیا ہو؟ سب سے پہلے جمالیاتی انداز میں اس منظر کو سامنے لائیے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ - آبِ رواں کے کنارے، سبزۂ نورستہ - گھنیرے درختوں کی چھاؤں، بہار کا موسم جس میں نہ زیادہ سردی نہ گرمی لَا یَرَوْنَ فِیْهَا شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِیْرًا (۷۶/۱۳) - دوسری طرف، اعلیٰ درجے کے صوفے - حریر و اطلس کے پردے - نرم و نازک ریشم کے ملبوسات - (۷۶/۲۱) - چاندی اور سونے کے برتن - بلوریں آبخورے - سونے کے کنگن - موتیوں کے ہار (۲۲/۲۳؛ ۳۵/۳۳)، (۷۶/۱۵-۲۱) - مختصراً یہ کہ مَا تَشْتَهِیْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْیُنُ (۴۳/۷۱)۔ اس میں ہر وہ شے ہوگی جس کی آرزو انسان کرے اور جس سے نگاہیں لذت یاب ہوں - حتّٰی کہ فَهُمْ فِیْ رَوْضَةٍ یُّحْبَرُوْنَ (۳۰/۱۵) - سرسبز و شاداب باغات میں نہایت شستہ اور اعلیٰ پایہ کی موسیقی کی محفلیں - حقیقت یہ ہے کہ اس لفظ (یُحْبَرُوْنَ) میں حسن و جمال، زیبائی و رعنائی اور انبساط و مسرت کے تمام مظاہر آجاتے ہیں خواہ وہ جنتِ نگاہ ہوں یا فردوسِ گوش - یہ ہے وہ جنتی معاشرہ جس کا وعدہ اس دنیا میں کیا گیا ہے اور جس کا تمثیلی بیان جنتِ اخروی کے سلسلہ میں قرآن کریم کے متعدد مقامات میں آیا ہے - آپ سوچئے کہ زیب و زینت کی جن حسین و جمیل اشیاء کو قرآن نے جماعتِ مومنین کی حسن کارانہ زندگی کا ماحصل بتایا ہے کیا انہی اشیاء کے استعمال کو خدا حرام قرار دے گا؟

یہ تو رہا خدا کی پیدا کردہ اشیائے کائنات کے حسن و جمال سے بہرہ یاب ہونے کا تذکرہ - اب یہ دیکھئے کہ

انسان کا مقام

تخلیقِ حسن میں خود انسان کا کیا مقام ہے - اس ضمن میں پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن کریم کے نقطۂ نگاہ سے خدا اور انسان کا باہمی تعلق کیا ہے؟ ان کا تعلق باہمی رفاقت کا ہے ـــــ نبی اکرمؐ کے ارشاد کے مطابق، خدا رفیقِ اعلیٰ ہے، فلہٰذا، انسان رفیقِ ادنیٰ - لیکن تعلق ان کا بہرحال رفاقت کا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں خدا کا متعین کردہ پروگرام انسان کے ہاتھوں پورا ہوتا ہے -

انسانی دنیا میں ایک چیز ہے تولید (PROCREATION) - یعنی افزائشِ نسل - اس میں انسان اور حیوان دونوں برابر ہیں - لیکن خدا اس سے بلند ہے - دوسری چیز ہے تخلیق (CREATION) ان میں حیوانات کا کوئی حصہ نہیں - لیکن خدا اور انسان اس میں دونوں شامل ہیں - خدا نے اپنے آپ کو "احسن الخالقین" کہا ہے ـــــ یعنی تخلیق کرنے والوں میں سب سے زیادہ حسین تخلیق کرنے والا - جب اس نے اپنے آپ کو خالقین میں شمار کیا ہے تو اس سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے علاوہ اور خالق بھی تسلیم کرتا ہے - خدا کے بعد یہ خالق، انسان کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ اس سے واضح ہے کہ جو خصوصیت انسان کو حیوان سے متمیز کرتی ہے وہ عملِ تخلیق ہے - اور اس عملِ تخلیق میں انسان اور خدا دونوں شامل ہیں، اس فرق کے ساتھ کہ خدا کا عملِ تخلیق، حسن کا بلند ترین شاہکار ہوتا ہے - لہٰذا جس انسان میں تخلیق (CREATIVENESS) کی صلاحیت نہیں وہ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتا ہے - انسانی سطح پر وہ پہنچ ہی نہیں پاتا - اسی لئے اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

ہر کہ او را قوتِ تخلیق نیست　　　نزدِ ما جز کافر و زندیق نیست

اور جوں جوں انسان، اپنے عمل تخلیق میں حسن پیدا کرتا جائے گا، وہ رفاقت میں خدا سے قریب تر ہوتا جائے گا۔ اور اس قربِ خداوندی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خود انسان کی اپنی ذات میں بھی حسن پیدا ہوتا جائے گا۔ عملِ خیر ہے ہی وہی جس سے حسنِ کائنات نکھرتا جائے اور انسان کی اپنی ذات سنورتی جائے۔ حسنِ کائنات میں یہی اضافے ہیں جن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے (انسان اور خدا کے مکالمہ میں) خدا کو مخاطب کرتے ہوئے، انسان کی زبان سے کہلوایا ہے کہ؎

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

موسیقی خدا کے پیدا کردہ خام مسالہ کے تخلیقی امتزاج سے انسان کیا کچھ پیدا کرتا ہے، دُنیا کی تاریخ تمدن و تہذیب، اور داستانِ آرٹ اور سائنس اس کی زندہ شہادت ہے۔ جہاں تک آرٹ، اور آرٹ میں موسیقی کا تعلق ہے، حضرت داؤد (علیہ) کو اس میں بڑا نمایاں مقام حاصل ہے۔ انہوں نے عبرانی موسیقی مدون کی تھی اور مصری اور بابلی مزامیر (سازوں) کو ترقی دے کر نئے نئے آلات ایجاد کئے تھے جن میں قانون اور بربط خاص طور پر مشہور ہیں۔ زبور ان کا صحیفہ ہے۔ اس میں، ہر باب کے پہلے یہ ہدایات موجود ہیں، کہ سرایہ مغنی ان آیات کو کس ساز کے ساتھ گائے۔ اس کے آخری باب میں ہے۔

قرنائی پھونکتے ہوئے خدا کی ستائش کرو۔ بین اور بربط چھیڑتے ہوئے اس کی ستائش کرو۔ طبلہ بجاتے ہوئے اور ناچتے ہوئے اس کی ستائش کرو۔ بلند آواز سے جھانجھ بجا کر اس کی ستائش کرو۔ خوش آواز جھانجھ بجا کر اس کی ستائش کرو۔

(تورات صفحہ ۶۱۶۔ شائع کردہ برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی لاہور ۱۹۲۲ء)

اس میں شبہ نہیں کہ تورات میں بہت کچھ تحریف ہو چکی ہے لیکن ہم موسیقی کے متعلق اس بیان کو اس لئے قابلِ قبول سمجھتے ہیں کہ جب قرآن کریم میں جنتی معاشرے میں موسیقی کی محفلوں کا ذکر ہے تو یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ حضرت داؤدؑ نے اس فن کی تہذیب و تدوین کی ہوگی۔ اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ خود ہمارے ہاں کی کتب احادیث کی شروح میں مذکور ہے کہ حضرت داؤدؑ باجے کے ساتھ گایا کرتے تھے (مثلاً حافظ ابن حجر عسقلانی کی فتح الباری)

کتب احادیث میں ہے کہ مسجد نبویؐ میں حبشیوں کا ناچ ہو رہا تھا اور حضور نبی اکرمؐ، امّ المومنین حضرت عائشہؓ کے ساتھ کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ حضرت عمرؓ کے متعلق جو تصور عام طور پر پیش کیا جاتا ہے وہ اس قسم کا ہے کہ آپ بڑے درشت مزاج، جارو یابس، عبوساً قمطریرا قسم کے انسان تھے، جن کے ہاتھوں میں ہر وقت دُرّہ، منہ میں جھاگ، آنکھوں میں شعلے اور ماتھے پر شکن رہتے تھے۔ یہ ان کے مزاج کی غلط تصویر ہے۔ وہ نہایت لطیف حسیات کے حامل اور بلند ترین ذوقِ جمالیات کے پیکر تھے۔ آپ کے ذوقِ شعری کے متعلق ذرا آگے چل کر ذکر آئے گا۔ جہاں تک موسیقی کا تعلق ہے آپ اس کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ عربوں کی موسیقی زیادہ تر حدی خوانی

اور حدی خوانی تک محدود تھی۔ اس سے آپ کیف اندوز بھی ہوتے تھے اور کبھی کبھی خود بھی ترنم سے شعر پڑھا کرتے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ بیان فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں حضرت عمرؓ کے مکان پر آیا تو میں نے سُنا کہ اندر حضرت عمرؓ حدی خوانوں کی طرح گا رہے ہیں۔ میں اندر گیا تو انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ جو کچھ میں پڑھ رہا تھا، تو نے اسے سُنا تھا۔ جب میں نے کہا ہاں تو فرمایا کہ جب ہم تنہا ہوتے ہیں تو جیسے عام لوگ گاتے ہیں، ہم بھی گاتے ہیں۔

خلوت ہی میں نہیں بلکہ جلوت میں بھی۔ ایک دفعہ آپ کسی قافلے کے ساتھ جا رہے تھے تو ایک شعر اِس ترنم کے ساتھ پڑھا کہ لوگ سننے کے لئے گرد جمع ہو گئے۔ آپ نے یہ دیکھا تو جھٹ سے قرآن پڑھنا شروع کر دیا۔ اس پر لوگ منتشر ہو گئے۔ پھر ویسے ہی گایا تو لوگ جمع ہو گئے اور جب آپ نے پھر قرآن پڑھنا شروع کر دیا تو وہ منتشر ہو گئے۔ ہنس کر فرمایا کہ "ان شیطانوں کی ذہنیت کو دیکھو۔ گانا گاتا ہوں تو لپک کر آ جاتے ہیں اور قرآن پڑھتا ہوں تو بھاگ جاتے ہیں"۔

ایک قافلے کے ساتھ، جس میں حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت ابن عباسؓ بھی تھے، چرواہوں کی ایک ٹولی آملی۔ شام ہوئی تو چرواہوں نے رباح فہری سے، جو مشہور گانے والا تھا، حدی خوانی کی فرمائش کی۔ رباح نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ قافلے کے ساتھ حضرت عمرؓ بھی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ تم شروع کرو۔ اگر حضرت عمرؓ نے روک دیا تو بند کر دینا۔ اس نے شروع کیا تو حضرت عمرؓ نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ بلکہ سُن کر خوش ہوئے۔ جب صبح ہوئی تو رباح سے کہا کہ اب بس کرو۔ ذکرِ الٰہی کا وقت آگیا ہے۔ دوسری شب چرواہوں نے رباح سے ایک اور گانے کی فرمائش کی جو حدی خوانوں ہی کے انداز کا تھا۔ اس سے بھی حضرت عمرؓ اسی طرح کیف اندوز ہوتے رہے۔ تیسری شب انہوں نے کچھ بازاری قسم کے گانے کی فرمائش کی تو اسے سُن کر آپ نے رباح سے کہا کہ یہ نہیں بھائی! اس سے دلوں میں انقباض اور کدورت پیدا ہوتی ہے۔

ان واقعات سے موسیقی کے جواز و عدمِ جواز، اور سرودِ حلال و حرام کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے کھینچے ہوئے یہی خطوطِ استیانہ تھے جن کی روشنی میں اقبالؒ نے کہا تھا کہ "سرودِ حلال" وہ ہے کہ

جس کی تاثیر سے آدم ہو غم و خوف سے پاک　　اور پیدا ہو ایازی سے مقامِ محمود

اس کے برعکس:-

اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام　　حرام میری نگاہوں میں نادوچنگ و رباب

مصوری

حضرت سلیمانؑ کے متعلق قرآن کریم میں ہے کہ انہوں نے مختلف علاقوں کے نادرہ کار صناع اپنے ہاں اکٹھے کر رکھے تھے؛ يَعْمَلُونَ لَهُ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيبَ وَتَمَاثِيلَ (۳۴/۱۳)۔ جو حضرت سلیمانؑ کی منشاء کے مطابق، ان کے لئے بڑے بڑے محلات تعمیر کرتے تھے اور ان میں مجسمے تراشتے یا تصاویر بناتے تھے۔ تماثیل کا لفظ مجسمے اور تصاویر دونوں کے لئے آسکتا ہے۔ جہاں تک تصاویر کا تعلق ہے ان کے جائز اور حلال ہونے میں اب کسی قسم کا شبہ ہی نہیں رہا۔ میں نے "اب" کا اضافہ اس لئے کیا ہے کہ بڑے بڑے مدعیانِ شریعت جو آج سے کچھ عرصہ پہلے تک، تصویر اتروانا تو کجا، تصویر کی طرف دیکھنا بھی حرام قرار دیتے تھے، اب پورزدے کر، بڑے طمطراق سے اپنی تصویریں کھچواتے اور ان کی نمائش کراتے ہیں۔ جہاں تک مجسمہ سازی

کا تعلق ہے، حال ہی میں حکومتِ سعودی عرب کی طرف سے، مودودی صاحب کو جو ایوارڈ ملا ہے، اس کے تمغہ (MEDAL) میں، شاہ فیصل (مرحوم) کی تصویر ڈھلی ہوئی ہے۔ یہ تو تصویر سے آگے بڑھ کر مجسمہ کے ذیل میں آ جاتا ہے۔ اس باب میں بھی حضرت عمرؓ کا مسلک بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ جب مدائن کی فتح کے بعد اسلامی لشکر، کسریٰ کے قصرِ ابیض میں داخل ہوا تو اس میں یہاں وہاں، مجسموں کے حسین و جمیل شاہکار نصب تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے انہیں نہایت احتیاط سے محفوظ رکھا اور حضرت عمرؓ نے ان کے اس فیصلے کی تصویب فرمائی اور اس طرح ان مجسموں کو ضائع ہونے سے بچا لیا۔

آرٹ۔ (یعنی فنونِ لطیفہ) میں چار اصناف ہی بنیادی شمار کی جاتی ہیں ـــــ مجسمہ سازی، تصویر کشی، موسیقی اور شاعری۔ پہلی تین کا ذکر آ گیا ہے۔ شاعری کے متعلق میں ذرا آگے چل کر عرض کروں گا۔ یہاں قرآن کریم کے ایک اہم نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، حُسن نام ہے صحیح صحیح توازن اور تناسب کا۔ جہاں کسی شے کا توازن بگڑا، حسن معدوم ہو گیا۔ اس کے برعکس، اگر مختلف اور باہم گر متضاد عناصر کے امتزاج میں توازن ملحوظ رکھا جائے، تو ان میں بھی حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ جن حقائق کو صفاتِ خداوندی کہہ کر پکارا جاتا ہے، ان میں باہمی تضاد ہے۔ وہ رحیم بھی ہے اور قہار بھی۔ وہ رؤف بھی ہے اور جبار بھی۔ لیکن یہ صفات، خدا کی ذات میں ایسے صحیح توازن اور اعتدال کے ساتھ جمع ہیں کہ قرآن ان کے مجموعہ کو

اسماء الحسنیٰ

اسماء الحسنیٰ سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی وہ صفات، جو بہ ہیئتِ مجموعی، حسین ترین انداز لئے ہوئے ہیں۔

انسان کے اندر بھی متضاد قوتیں اور جذبات موجود ہیں۔ جس انسان کے اندر، ان قوتوں اور جذبات میں صحیح صحیح توازن پیدا ہو جاتا ہے، اسے متوازن شخصیت (BALANCED PERSONALITY) کا حامل کہا جاتا ہے۔ ان قوتوں اور جذبات کا اعتدال و توازن کے ساتھ استعمال، حسنِ عمل کہلاتا ہے۔ آرٹ میں یہ اعتدال اور توازن، نازک ترین حد تک پہنچا ہوا ہوتا ہے۔ کسی حسین ترین تصویر میں آنکھ کی سیاہی میں ایک نقطہ بھر کی کمی یا زیادتی اسے بدترین شکل میں تبدیل کر دیتی ہے۔ بلند ترین موسیقی میں، کسی سُر میں ذرا سا زیادہ ابھار یا اتار، راگ کا روپ بگاڑ کر رکھ دیتا ہے۔

اعتدال

قرآن کہتا ہے کہ جب خود ان چیزوں میں حسن نام ہے صحیح توازن و اعتدال کا، تو ان سے لذت یاب ہونے میں بھی اعتدال و توازن کا قائم رکھنا نہایت ضروری ہے۔ حدِ اعتدال سے ذرا بھی آگے بڑھے، تو یہی حسن، شر میں تبدیل ہو جائے گا۔ دیکھئے جہاں اس نے کہا تھا کہ وہ کون ہے جو خدا کی پیدا کردہ اشیائے زیبائش و آرائش اور حسین و جمیل سامانِ زیست کو حرام قرار دے، تو وہیں یہ بھی کہہ دیا تھا کہ ان سے بہرہ یاب ہو لیکن وَلَا تُسْرِفُوْا۔ حد سے آگے نہ بڑھو۔ (۷/۳۱) اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ۔ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کیا جاتا۔ یعنی ان اشیاء سے لذت یاب ہونا خدا کے نزدیک ناپسندیدہ نہیں۔ اس کے نزدیک حد سے بڑھنا ناپسندیدہ ہے۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جسے اس نے سورۂ کہف کی اس آیت میں، جسے میں شروع میں پیش کر چکا ہوں۔ کہا ہے کہ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا۔ ہم نے سطحِ ارض پر بڑی زیب و زینت

کی چیزیں پیدا کی ہیں۔ لِنَبْلُوَھُمْ اَیُّھُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۱۸/۷)۔ تاکہ یہ دیکھا جائے کہ ان میں سے کون اپنے اعمالِ حیات میں توازن و اعتدال قائم رکھتا ہے۔ یہ تو پھر بھی زیب و زینت سے متعلق ہے۔ وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ وَلِلّٰہِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی فَادْعُوْہُ بِھَا۔ صفاتِ خداوندی اپنے اندر انتہائی حسن و اعتدال لئے ہوئے ہیں۔ انہیں اسی حسن و اعتدال کے ساتھ اپنے اندر اجاگر کرو۔ وَذَرُوا الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ اَسْمَآئِہٖ (۷/۱۸۰)۔ جو لوگ ان میں اعتدال قائم نہیں رکھتے بلکہ اس کی کسی ایک صفت کو لے کر افراط کی طرف نکل جاتے ہیں، ان سے کنارہ کش ہو جاؤ۔ جس طرح مثلاً عیسائیوں نے خدا کی صفت "رحیمی" میں اس قدر غلو کیا کہ قانونِ مکافاتِ عمل کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ اس سے نہ صرف ان کی اپنی ذات کا حسن بگڑ گیا بلکہ انسان کی تمدنی دنیا میں بھی فساد ہی فساد پیدا ہو گیا۔

یہ ہے وہ بنیادی شرط جس کے ساتھ قرآن کریم جمالیات سے متمتع ہونے کی تاکید کرتا ہے۔ یعنی زندگی کے افادی اور جذباتی گوشوں میں صحیح صحیح تناسب قائم رکھتے ہوئے، افادی اور جذباتی گوشوں کی مثال پٹرول اور موبل آئل کی سمجھئے۔ اگر کار میں پٹرول ہی پٹرول ہو۔ موبل آئل نہ ہو، تو اس کا انجن خود اپنی حرارت سے پھک جائے گا۔ اور اگر اس کی پٹرول کی ٹنکی میں بھی موبل آئل ڈال دیا جائے —— نہیں، اگر موبل آئل ذرا اپنے مقام سے آگے بڑھ کر، پٹرول میں دخل انداز ہو جائے —— تو موٹر کے پرزے جکیٹ ہو کر رہ جائیں گے۔ یاد رکھئے۔ جمال اور جلال کے صحیح امتزاج ہی سے، زلفِ کائنات کی مشاطگی ہو سکتی ہے، اقبالؒ کے الفاظ میں۔

نہ جدا رہے نوا گر تب و تابِ زندگی سے   کہ ہلاکیٔ اُمم ہے یہ طریقِ نے نوازی

بلکہ اور واضح الفاظ میں۔

اے اہلِ نظر، ذوقِ نظر خوب ہے، لیکن   جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ ہنر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو   جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں   جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

وہ پیمانہ کیا ہے

سوال یہ ہے کہ وہ پیمانہ کیا ہے جس سے یہ ماپا جا سکے کہ ہم نے افادی اور جمالیاتی گوشوں میں صحیح صحیح توازن قائم رکھا ہے، ان کے اعتدال کو بگڑنے نہیں دیا۔ ظاہر ہے کہ اسے افراد کے اپنے فیصلے پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ جس طرح، مختلف علوم کے ہر شعبے اور فن کے ہر گوشے کے لئے کچھ بنیادی اصول اور معیار ہیں، اسی طرح، افادیت اور جمالیات میں توازن قائم رکھنے کے لئے بھی بنیادی اصول اور معیار ہیں۔ یہ اصول وہ ہیں جنہیں قرآن کریم حدود اللہ کہہ کر پکارتا ہے۔ یعنی خدا کی باندھی ہوئی حدیں۔ اور یہ معیار وہ ہیں جنہیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ یعنی خدا کے مقرر کئے ہوئے پیمانے جن میں کبھی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ لا تبدیل لکلمٰت اللّٰہ۔ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے، ان پیمانوں کے مطابق ان سے بہرہ یاب ہو جئے تو یہ عین مطابق اسلام ہو گا۔ ان حدود کو پھاند جایئے اور ان پیمانوں کو توڑ دیجئے تو یہ حرام ہو جائے گا۔ یہ حدود فراموش اور پیمانہ شکن ہیں وہ فنکار جن کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ:-

وہ نغمہ سردیِ خونِ غزل سرا کی دلیل — کہ جس کو سُن کے ترا چہرہ تابناک نہیں
نوا کو کرتا ہے موجِ نفس سے زہر آلود — وہ تے نواز کہ جس کا ضمیر پاک نہیں

یہ حدیں اور پیمانے قرآن کے اندر محفوظ ہیں جو اس خدا کی کتاب ہے جو کائنات کے افادی اور جمالیاتی گوشوں کا خالق اور انسانی ممکنات کی نشوونما کے تقاضوں سے باخبر ہے۔

اب آیئے شاعری کی طرف۔ قرآن کریم میں نبی اکرمؐ کے متعلق ہے۔ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ (۳۶/۶۹)۔ ہم نے اسے شاعری نہیں سکھائی۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری ایک پیغامبر کے شایانِ شان ہوتی ہی نہیں۔ اس سے بظاہر یہ متبادر ہوتا ہے کہ قرآن کریم شاعری کو پسند نہیں کرتا۔ لیکن یہ نکتہ ذرا تشریح طلب ہے۔

سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ قرآن کریم نے جب شاعری کی مذمت کی ہے تو اس سے یہ مراد نہیں کہ اس کے نزدیک نثر میں بیان کردہ مفہوم قابلِ قبول ہوتا ہے اور اسی مفہوم کو اگر نظم میں بیان کر دیا جائے تو وہ مذموم اور مردود قرار پا جاتا ہے۔ ایسا سمجھنا صحیح نہیں۔ قرآن، اسلوبِ بیان سے بحث نہیں کرتا۔ مقصودِ بیان سے بحث کرتا ہے۔ شاعری سے اس کی مراد وہ جذبات پرستی ہے جس کا حقائق سے واسطہ نہیں ہوتا۔ اور قرآن، زندگی کے حقائق سے بحث کرتا ہے۔ چنانچہ جس آیت کو میں نے ابھی ابھی پیش کیا ہے اور جس میں کہا گیا ہے کہ ہم نے رسول کو شاعری نہیں سکھائی اور نہ ہی شاعری، ایک رسول کے شایانِ شان ہوتی ہے تو اس سے آگے ہے: اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ (۳۶/۶۹)۔ جو کچھ ہم نے رسول کو دیا ہے وہ تاریخی شواہد اور زندگی کے بنیادی اصول اور واضح قوانین ہیں۔ اور ان سے مقصد یہ ہے لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (۳۶/۷۰)۔ جن لوگوں میں زندہ رہنے کی صلاحیت اور آرزو ہے یہ انہیں، اس کے ذریعے، زندگی کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر سکے۔ قرآن کریم تاریخی شواہد اور زندگی کے ٹھوس حقائق سے بحث کرتا ہے اور شاعری، اس کے خلاف، جذبات سے کھیلتی اور لطائف سے اس کا جی بہلاتی ہے۔ رسول کے سامنے، زندگی کا ایک متعین نصب العین ہوتا ہے اور اس کا ہر قدم اس نصب العین کی طرف اٹھتا ہے۔ نہ مشکلات و مصائب، اس کے لئے سنگِ راہ بنتی ہیں، اور نہ ہی مفاد پرستانہ جاذبیتیں، اس کی دامن گیر ہو کر حصولِ مقصد کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ گوئٹے کے الفاظ میں اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

رسول کی حیثیت

در راہِ او بہار پری خانہ آفرید — نرگس دمید و لالہ دمید و سمن دمید
گل عشوہ داد و گفت یکے پیشِ ما بایست — خندید غنچہ و سرِ دامانِ او کشید
تا آشنائے جلوہ فروشانِ سبز پوش — صحرا برید و سینۂ کوہ و کمر درید

زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ می رود
در خود یگانہ، از ہمہ بے گانہ می رود

رسول کی یہ کیفیت زندگی کی جمالیاتی وادیوں میں ہوتی ہے۔ جہاں تک جلال کا تعلق ہے اس کا عالم یہ

ہوتا ہے کہ

دریائے پرخروش ز بند و شکن گذشت　　　از تنگنائے وادی و کوہ و دمن گذشت
یکساں چوں سیل کردہ نشیب و فراز را　　　از کاخِ شاہ و بارہ و کشت و چمن گذشت
بیتاب و تند و تیز و جگر سوز و بے قرار　　　در ہر زماں بتازہ رسید از کہن گذشت

زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ می رود
در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ می رود

یہ کیفیت ہے مصافِ زندگی میں ایک رسول کی جو عالمگیر انقلاب کا داعی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، شاعروں کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ۙ (۲۶/۲۲۵)۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ وہ کس طرح اَلْهِيْم کی طرح، مختلف وادیوں اور بیابانوں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ اَلْاَهْيَمُ اس اونٹ کو کہتے ہیں جسے جھوٹی پیاس کی بیماری لگ جائے اور وہ اسے مختلف چراگاہوں اور نخلستانوں میں لئے لئے پھرے لیکن کسی جگہ اس کی تشنگی دور نہ ہو۔ شاعر کے سامنے چونکہ زندگی کا متعین نصب العین نہیں ہوتا، اس لئے وہ کبھی جذبات کی اِن وادیوں میں مارے مارے پھرتا ہے اور کبھی تخیلات کی اُن جولانگاہوں میں۔ اور چونکہ یہ جذبات بھی جھوٹے ہوتے ہیں اس لئے اس کی کہیں تسکین ہی نہیں ہوتی۔ وہ ساری عمر یونہی بھٹکتا پھرتا ہے۔ وَيَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ اور اس کے پیچھے لگنے والے بھی بھٹکتے پھرتے ہیں، لیکن شاعر کو اس سے دھوکا لگ جاتا ہے کہ اس کے متبعین کی جماعت بہت بڑی ہے۔ حالانکہ یہ جماعت نہیں، ایک انبوہ کثیر ہوتا ہے جس کی حالت ٹڈی دَل کی سی ہوتی ہے۔ (الغاوی ٹڈی دَل کو کہتے ہیں)۔ دیکھنے میں لاکھوں لیکن بغیر کسی نصب العین کے۔ ان سب کا آخری نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ پھر، ان شاعروں کی اپنی زندگی کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ۔ وہ ایسی باتیں کہتے ہیں جنہیں خود کر کے نہیں دکھاتے۔ اس لئے کہ جب پیاس ہی جھوٹی ہو تو قول اور عمل میں موافقت کیسے ہو؟

اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک 'شاعری' پیرایۂ بیان کا نام نہیں۔ یہ ایک خاص ذہنیت کا نام ہے جو اُس ذہنیت کی نقیض ہوتی ہے جسے قرآن پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اسی لئے اس نے شاعروں کی اس ذہنیت کا ذکر کرنے کے بعد کہا ہے اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ ان کے برعکس وحی کی صداقتوں پر ایمان رکھنے والوں کی ذہنیت ہے جو ایک متعین نصب العین پر یقین رکھتے ہیں اور ایسے پروگرام پر عمل پیرا رہتے ہیں جو ان کی اپنی ذات کی صلاحیتوں کی بھی نشوونما کرے، اور دنیا کے بگڑے ہوئے کام بھی سنوارے وَانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا۔ جب ان پر کوئی ظلم اور زیادتی کرے، تو وہ سوداؔ کی طرح "غنچے" کو آواز نہیں دیتے کہ "ذرا لانا تو میرا قلمدان ہجو لکھ کر اسے مزہ چکھا دوں"۔ وہ اُس سے اُس زیادتی کا بدلہ لیتے ہیں وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ۝ (۲۶/۲۲۷)۔ اور ایک ایسا نظام قائم کرتے ہیں جس میں ظلم اور زیادتی کرنے والے بدلگام نہ پھرتے رہیں کہ جو ان کے جی میں آئے کریں۔ انہیں کوئی روکنے ٹوکنے والا ہی نہ ہو۔ اس نظام میں اس قسم کے لوگوں کو صاف نظر آجاتا ہے کہ انہیں ان کی غلط روش

سے ہٹا کر کس مقام کی طرف لایا جائے گا اور ان کا ٹھکانہ کون سا ہوگا۔

یہ ہے فرق شاعرانہ ذہنیت اور مومنانہ ذہنیت میں۔ قرآن کریم نے اس (شاعرانہ) ذہنیت کی مذمت کی ہے، نہ کہ شعر کی مذمت۔ کالرج نے جب کہا تھا کہ شاعری کی ضد (ANTI - THESIS) نثر نہیں بلکہ سائنس ہے، تو اس سے اُس نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا۔

شاعری اور نبوّت

اس مقام پر ایک اور نکتہ کی وضاحت بھی ضروری ہے۔ دیگر اقوام عالم (مثلاً یونان وغیرہ) کی طرح عربوں کے ہاں بھی یہ عقیدہ تھا کہ (کاہنوں اور مجوسیوں کی طرح) شاعر کو بھی الہام ہوتا ہے۔ اس لئے وہ نبوت کو بھی از قبیل شاعری سمجھتے تھے۔ وہ رسول اللہؐ کو کبھی ساحر، کبھی کاہن اور کبھی شاعر کہتے تھے۔ قرآن کریم نے اس عقیدہ کی بھی تردید کی اور کہا کہ نبوت، شاعری نہیں۔ شاعروں کا ہاتف اور سروش، ان کے اپنے تخیلات کی تخلیق ہے۔ اس کے برعکس، وحیٔ نبوت ایک خارجی حقیقت ہے جو نبی کے اپنے جذبات۔ تخیلات یا وجدان کی پیداکردہ نہیں ہوتی۔ قرآن کریم جب شاعروں کی مذمت کرتا ہے تو اس سے اس کا مقصد اس عقیدہ کی تردید بھی ہوتا ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ (مصوری اور موسیقی کی طرح) قرآنِ کریم شعر کی مذمت نہیں کرتا۔ وہ دیکھتا یہ ہے کہ شاعر کہتا کیا ہے؟ اس باب میں اس کا معیار یہ ہے کہ

سینہ روشن ہو تو ہے سوزِ سخن عینِ حیات
ہو نہ روشن تو سخن مرگِ دوام اے ساقی

اور سینے کو روشنی، خدا کی عطا کردہ مستقل اقدار کی تنزیل ہی سے مل سکتی ہے۔ جب سینہ اس شمع نورانی سے روشن ہو، تو پھر شاعر کے سامنے زندگی کی تمام شاہراہیں جگمگاتی چلی جاتی ہیں اور وہ جنت سے نکلے ہوئے آدم کو پھر سے جنت کی طرف لے جانے والا راستہ دکھاتا ہے یہ وہ مقام ہے جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

شعر را مقصود اگر آدم گری است — شاعری ہم وارثِ پیغمبری است

اس انداز کی شاعری کی نشیدِ حیات افزا محفل نبویؐ میں بھی وجہ فردوس گوش ہوتی تھی۔ حضرت حسانؓ بن ثابت خود نبی اکرمؐ کے حضور شعر پڑھا کرتے تھے۔ بلکہ بعض اوقات حضورؐ ان سے شعر خوانی کی فرمائش کیا کرتے تھے۔ شعر و شاعری کے متعلق یہی انداز حضرت عمرؓ کا تھا۔ وہ شعر کو بدل پسند کرتے تھے، لیکن اسی شعر کو جو حقائق کا آئینہ دار ہو اور زندگی اور حیات کا پیغامبر۔ اقبالؒ کے الفاظ میں

وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے — یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل

وہ خود اپنے بیٹے (عبدالرحمٰن) سے کہا کرتے تھے کہ "بیٹا! اچھے اچھے شعر یاد کیا کرو تاکہ تمہارے ادب میں اضافہ ہو۔ جسے اچھے شعر یاد نہ ہوں وہ کبھی ادیب نہیں بن سکتا"۔

عربوں کی شاعری کے متعلق فرمایا:۔

اہلِ عرب کا بہترین فن اشعار ہیں کہ انسان اپنی ضروریات میں ان سے کام لیتا ہے۔ یہ سخی کو

مائل بہ کرم کر دیتا ہے جتنی کہ بخیل کا دل بھی نرم کر دیتا ہے۔

ایک دفعہ فرمایا :-

شعر ایک ایسی قوم کا فن تھا جس کے پاس اس سے بہتر کوئی فن نہیں تھا۔ جب اسلام آیا تو اہلِ عرب جہاد میں مصروف ہو گئے اور شعر اور اس کی روایات سے غافل ہو گئے۔ بعد ازاں جب اسلام پھیل گیا۔ فتوحات کی کثرت ہو گئی اور اہلِ عرب شہروں میں اطمینان سے بیٹھ گئے تو پھر روایتِ شعر کی طرف رجوع کرنے لگے۔ ان کے پاس نہ کوئی مدون دیوان تھا نہ کوئی لکھی ہوئی کتاب۔ بہت سے عرب طبعی موت مر چکے یا تلوار کی نذر ہو چکے تھے۔ لہٰذا جو کچھ اس نے پایا اسے یاد کر لیا، اگرچہ بہت سا شعری سرمایہ ضائع ہو گیا اور بہت کم محفوظ رہا۔

یہ تو بالتحقیق نہیں کہا جا سکتا آپ خود بھی شعر کہتے تھے یا نہیں۔ لیکن تاریخی واقعات اس کی شہادت دیتے ہیں کہ آپ کو اس قدر شعر یاد تھے کہ جو اہم بات بھی آپ کے سامنے آتی اس کے متعلق آپ حسبِ حال شعر سنا دیا کرتے۔ اور شعر کا ذوق اتنا بلند اور مذاق ایسا سلیم تھا کہ بڑے بڑے شعراء کا کلام آپ کے سامنے محاکمہ کے لئے پیش کیا جاتا اور آپ اس سلسلہ میں ایسے لطیف نکات بیان فرماتے کہ اہلِ مجلس عش عش کر اٹھتے۔ کتبِ محاضرات وادب، آپ سے متعلق اس قسم کی داستانوں سے بھری پڑی ہیں۔ (شاہکارِ رسالت)

یہ وہ شاعری ہے جو دلوں کی دنیا میں انقلاب پیدا کر کے، ہر دور کے فرعونوں، ہامانوں اور قارونوں کا تختہ الٹ کر رکھ دیتی ہے۔

صد نالۂ شبگیرے - صد صبح بلاخیزے　　صد آہِ شرر ریزے یک شعرِ دلاویزے

اس کے برعکس، غلامانہ ذہنیت کی آفریدہ شاعری ہے جس میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

می چکد از خامہ ہا مضمونِ موت　　ہر کجا افسانہ و افسونِ موت

یہ وہ شاعری ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ

رہزنِ قلب است و ابلیسِ نظر

اس میں خود شاعر کی نازک مزاجی کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ

غنچہ چٹکا تو کہا سر میں دھمک ہوتی ہے

اقبالؒ کے الفاظ میں :-

از نزاکت ہائے طبع موشگافِ او مپرس　　کز دمِ بادے زجاجِ شاعر ما بشکند

کے تواند گفت شرحِ کارزارِ زندگی　　می پرد رنگش حبابے گر بدریا بشکند

قرآن کا پیغام، حیات کا پیغام ہے۔ انقلاب کا پیغام ہے۔ غلط نظامِ زندگی کی ہر بساط کو الٹ کر اس کی جگہ صحیح نظامِ زندگی متشکل کرنے کا پیغام ہے۔ یہ انسانی ذات کے نکھرنے اور حسنِ کائنات کے نکھارنے کا پیغام ہے۔ یہ خود سنور کر دنیا کے ہر بگاڑ کو سنوارنے کا پیغام ہے۔ یہ حیوانی سطحِ زندگی پر جینے والوں کو مقامِ آدمیت سے متعارف کرانے، اور آدم کو انسانیت کی سطح پر لے جانے کا پیغام ہے۔ یہ پیغام ہے انسان

کو اس بلند مقام سے متعارف کرانے کا جہاں، وہ (نیٹشے کے الفاظ میں) "اپنے مقدر کے ستاروں کو جھک کر دیکھے"۔ نغمہ ہو یا شعر۔ رنگ ہو یا چنگ، اگر وہ اس پیغامِ حیات آور کا نقیب ہے، تو وہ حلال ہی نہیں، فریضۂ حیات ہے۔ اور اگر وہ جیتے جاگتے انسانوں کو موت کا پیغام دیتا ہے، تو اس کے حرام ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ یہ وہ آرٹ ہے جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ

تو ہے میتِ یہ ہنر تیرے جنازے کا امام
نظر آئی جسے مرقد میں شبستانِ حیات

آرٹ وہی حیات بخش ہو سکتا ہے جس میں جلال اور جمال کا صحیح امتزاج ہو۔ اگر یہ نہیں تو اس کی حیثیت برگِ حشیش سے زیادہ کچھ نہیں۔

دلبری بے قاہری جادوگری است — دلبری با قاہری پیغمبری است

یہ ہے، عزیزانِ من! میری بصیرت کے مطابق قرآن کریم کی رو سے آرٹ کی حیثیت۔

عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمالی
عجم کا حسنِ طبیعت۔ عرب کا سوزِ دروں

اگر بایں نرسیدی، تمام بولہبی است ——— لہو گرما دینے والی موسیقی کے اثرات کا اندازہ تو ہم بھارت کے ساتھ اپنی ۱۹۶۵ء کی جنگ میں کر چکے ہیں۔ ۶ ستمبر کی صبح، لاہور پر ہندوؤں کے اچانک حملہ سے فضا میں جو اضطرابی کیفیت پیدا ہو گئی تھی، شام کو جب ریڈیو سے ——— ساتھیو! مجاہدو!! جاگ اٹھا ہے سارا وطن ——— کی فلک شگاف آواز، پورے دبدبہ اور طنطنہ کے ساتھ سکوت شکن ہوئی ہے تو اس نے ہوا کا رُخ بدل دیا۔ اس سے دلوں میں نئے ولولے بیدار ہو گئے اور ہمتیں بلند سے بلند تر ہوتی چلی گئیں۔ اس کے بعد، مسلسل سترہ دن تک، ملی ترانوں نے فضا میں جو ارتعاش پیدا کر رکھا تھا اس کے اثرات کی داستانیں ان سپاہیوں سے سنئے جن کے لئے یہ آوازیں، زندگی اور حرارت کا ہزار سامان اپنے جلو میں لئے، فردوسِ گوش بنتی تھیں۔ اور ابھی یہ ہمارا پہلا تجربہ تھا ——— اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اگر پیغامِ حیات افروز کے ساتھ، مغنّیِ آتش نفس کی نشید جمال انگیز بھی شامل ہو جائے تو یہ کس قدر وجہ فروغِ جذبات ہو سکتے ہیں۔ اور جب ان جذبات سے، وحی کی روشنی میں کام لیا جائے تو شہپرِ انسانیت کس طرح "بال و پرِ روح الامین" پیدا کر لیتا ہے ——— میں اسے پھر دہرا دوں کہ فطرت کی طرف سے انسان کو جس قدر صلاحیتیں عطا ہوئی ہیں وہ بجائے خویش نہ خیر ہیں نہ شر۔ ان کا استعمال انہیں خیر یا شر بنا دیتا ہے۔ اگر ان صلاحیتوں کو خدا کی عطا کردہ مستقل اقدار کے تابع رکھا جائے تو اس کا نتیجہ خیر ہی خیر ہوتا ہے ——— خواہ وہ شعر و سخن کے حسین پیکر میں ہوں یا رنگ و چنگ کے حریری لباس میں ——— انسانی صلاحیتیں!

لادیں ہوں تو ہیں زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہوں دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

آرٹ کے متعلق جو کچھ میں نے اپنے الفاظ میں کہا ہے کیا یہ ہماری خوش نصیبی نہ ہوگی کہ اس کے متعلق

شاہکارِ خداوندی، جلال و جمال کے اُس حسین ترین پیکرِ اقدس و اعظمؐ کے ارشاداتِ گرامی ہمارے لئے وجۂ فروغِ دیدہ ہوں جسے خالقِ کائنات نے، عالمگیر انسانیت کے لئے اسوۂ حسنہ (حسین ترین ماڈل) قرار دیا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ سنہ ۱۹۱۶ء میں علامہ اقبالؒ نے ایک مختصر سا مقالہ سپردِ قلم فرمایا جس کا عنوان تھا۔

جنابِ رسالت مآبؐ کا ادبی تبصرہ

میرے خطاب میں اس مقالہ کا اضافہ، تسبیح کے دانوں میں امام کی حیثیت رکھتا ہے، ملاحظہ فرمایئے:۔

"حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عہد کی عربی شاعری کی نسبت وقتاً فوقتاً جن ناقدانہ خیالات کا اظہار فرمایا ان کی روشنی صفحاتِ تاریخ کے لئے خطِ شعاع کا حکم رکھتی ہے۔ لیکن دو موضوعوں پر جو تنقیدات آپؐ نے فرمائیں ان سے مسلمانانِ ہند کو آج کل کے زمانہ میں بہت بڑا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اس لئے کہ ان کا ادب ان کے قومی انحطاط کے دَور کا نتیجہ ہے اور آج کل انہیں ایک نئے ادبی نصب العین کی تلاش ہے۔ شاعری کیسی ہونی چاہیئے اور کیسی نہ ہونی چاہیئے یہ وہ عقدہ ہے جسے جنابِ رسالت مآب صلعم کے وجدان نے اس طرح حل کیا ہے۔ امراء القیس نے اسلام سے چالیس سال پہلے کا زمانہ پایا ہے۔ روایت ہمیں بتاتی ہے کہ جنابِ پیغمبر صلعم نے اس کی نسبت ایک موقع پر حسبِ ذیل رائے ظاہر فرمائی " اشعر الشعراء وقائدھم الی النار" یعنی وہ شاعروں کا سرتاج تو ہے ہی لیکن جہنم کے مرحلے میں ان سب کا سپہ سالار بھی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ امراء القیس کی شاعری میں وہ کون سی باتیں ہیں جنہوں نے حضور سرورِ کائنات صلعم سے یہ رائے ظاہر کروائی۔ امراء القیس کے دیوان پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں شرابِ ارغوانی کے دور، عشق و حُسن کی ہوشرُبا داستانوں اور جاں گداز جذبوں، آندھیوں سے اڑی ہوئی پرانی بستیوں کے کھنڈرات کے مرثیوں، سنسان ریتیلے ویرانوں کے دل ہلا دینے والے منظروں کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ اور یہی عرب کے دورِ جاہلیت کی کل تخلیقی کائنات ہے۔ امراء القیس قوتِ ارادی کو جنبش میں لانے کی بجائے اپنے سامعین کے تخیل پہ جادو کے ڈورے ڈالتا اور ان میں بجائے ہوشیاری کے بے خودی کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حکیمانہ تنقید میں فنونِ لطیفہ کے اس اہم اصول کی توضیح فرمائی ہے کہ صنائع و بدائع کے محاسن اور انسانی زندگی کے محاسن یہ کچھ ضروری نہیں کہ یہ دونوں ایک ہی ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ شاعر بہت اچھا شعر کہے لیکن وہی شعر پڑھنے والے کو اعلیٰ علیین کی سیر کرانے کی بجائے اسفل السافلین کا تماشا دکھا دے۔ شاعری دراصل ساحری ہے اور اس شاعر پہ حیف ہے جو قومی زندگی کی مشکلات و امتحانات میں دلفریبی کی شان پیدا کرنے کی بجائے فرسودگی و انحطاط کو صحت اور قوت کی تصویر بنا کر دکھا دے اور اس طور پہ اپنی قوم کو ہلاکت کی طرف لے جائے۔ اس کا تو فرض ہے کہ قدرت کی لازوال دولتوں میں سے زندگی اور قوت کا جو حصّہ اسے دکھایا گیا ہے اس میں اوروں کو بھی شریک کرے نہ یہ کہ اٹھائی گیرہ بن کر جو رہی سہی پونجی ان کے پاس ہے اس کو بھی ہتھیا لے۔

ایک دفعہ قبیلۂ بنو عبس کے مشہور شاعر عنترہ کا یہ شعر حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سُنایا گیا۔

ولقد ابیت علی الطوی واظلہ   حتی انال بہ کریم الماکل

(ترجمہ) میں نے بہت سی راتیں محنت و مشقت میں بسر کی ہیں، تاکہ میں اکلِ حلال کے قابل ہو سکوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن کی بعثت کا مقصدِ وحید یہ تھا کہ انسانی زندگی کو صحت مند بنائیں اور اس کی آزمائشوں اور سختیوں کو خوش آیند اور مطبوع کر کے دکھائیں۔ اس شعر کو سن کر بے انتہا محظوظ ہوئے اور اپنے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ "کسی عرب کی تعریف نے میرے دل میں اس کا شوقِ ملاقات نہیں پیدا کیا لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ اس شعر کے نگارندہ کے دیکھنے کو میرا دل بے اختیار چاہتا ہے۔"

اللہ اکبر! توحید کا وہ فرزندِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم جس کے چہرۂ مبارک پر ایک نظر ڈال لینا نظارگیوں کے لئے دنیوی برکت اور اخروی نجات کی ورگونہ سرمایہ اندوزی کا ذریعہ تھا خود ایک بت پرست عرب سے ملنے کا شوق ظاہر کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس عرب نے اپنے شعر میں ایسی کون سی بات کہی تھی؟

رسول اللہ صلی اللہ نے جو عزت عنترہ کو بخشی اس کی وجہ ظاہر ہے۔ عنترہ کا شعر ایک صحت بخش زندگی کی جیتی جاگتی، بولتی چالتی تصویر ہے۔ حلال کی کمائی میں انسان کو جو سختیاں اٹھانی پڑتی ہیں، جو کڑیاں جھیلنی پڑتی ہیں ان کا نقش پر دۂ خیال پر شاعر نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ کھینچا ہے۔ حضور خواجۂ دو جہان صلعم (روحی انت داعی) نے جو اس قدر شعر کی تعریف فرمائی اس سے صنعت[1] کے ایک دوسرے بڑے اصول کی شرح ہوتی ہے کہ صنعت[1] حیاتِ انسانی کے تابع ہے اس پر فوقیت نہیں رکھتی۔

ہر وہ استعداد جو مبدءِ فیض نے فطرتِ انسانی میں ودیعت کی ہے اور ہر وہ توانائی جو انسان کے دل و دماغ کو بخشی گئی ہے ایک مقصدِ وحید اور ایک غایت الغایات کے لئے وقف ہے یعنی قومی زندگی جو آفتاب بن کر چمکے، قوت سے لبریز، جوش سے سرشار ہو، ہر انسانی صنعت[1] اس غایتِ آخرین کی تابع اور مطیع ہونی چاہیئے اور ہر شئے کی قدر و قیمت کا معیار یہی ہونا چاہیئے کہ اس میں حیات بخشی کی قابلیت کس قدر ہے۔ تمام وہ باتیں جن کی وجہ سے ہم جاگتے جاگتے اونگھنے لگیں اور جو جیتی جاگتی حقیقتیں ہمارے گرد و پیش موجود ہیں (کہ انہیں پر غلبہ پانے کا نام زندگی ہے) ان کی طرف سے آنکھوں پر پٹی باندھ لیں انحطاط اور موت کا پیغام ہے۔ صنعت گر کو حِنیا بیگم کے حلقۂ عشاق میں داخل نہ ہونا چاہیئے۔ مصورِ فطرت کو اپنی رنگ آرائیوں کا اعجاز دکھانے کے لئے افیون کی چسکی سے احتراز واجب ہے۔ یہ پیش پا افتادہ فقرہ جس سے ہمارے کانوں کی آئے دن تواضع کی جاتی ہے کہ "کمالِ صنعت اپنی غایت آپ ہے[2]" انفرادی، اجتماعی انحطاط کا ایک عیارانہ حیلہ ہے جو اس لئے تراشا گیا ہے کہ ہم سے زندگی اور قوت دھوکا دے کر چھین لی جائے۔ غرض یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجدانِ حقیقی نے عنترہ کے شعر کی خوبیوں کا جو اعتراف کیا۔ اس نے اس اصل الاصول کی بنیاد ڈال دی کہ صنعت کے ہر کمال کی صحیح ارتقاء کیا ہونی چاہیئے۔

(ستارۂ صبح، لاہور ۱۹۱۷ء)

---

[1] انسانی تخلیق یا آرٹ (طلوعِ اسلام)

[2] ادب برائے ادب (طلوعِ اسلام)

نقد و نظر

(صدیقۂ کائنات" مصنفہ حکیم فیض عالم صدیقی۔ شائع کردہ بک زنر چوک تفصیل شہید مین بازار جہلم ضخامت قریب اڑھائی سو صفحات۔ متوسط تختی۔ قیمت مجلد پچیس روپے)

یہ ام المومنین حضرت عائشہؓ الصدیقہ کی سیرت پر مشتمل تصنیف ہے۔ دیگر امہات المومنینؓ کی طرح حضرت عائشہؓ کے کوائفِ حیات بھی چند صفحات میں سما سکتے ہیں لیکن ان کے خلاف ہماری وضعی تاریخ میں جو سازش کی گئی ہے، اسے بے نقاب کرنے اور ان کے خلاف عائد کردہ اعتراضات کا جواب دینے کے لئے تفصیل کی ضرورت ناگزیر ہو جاتی ہے۔ ہماری وضعی روایات کی رو سے ان کے متعلق جو کچھ کہا جاتا ہے ان میں دو ایک نکات بڑے اہم ہیں اور قیامت یہ کہ انہیں ہمارے ہاں مسلمات کے طور پر مانا جاتا ہے۔ مثلاً

(۱) نبی اکرمؐ کے ساتھ نکاح کے وقت ان کی عمر چھ سال اور رخصتی کے وقت نو سال تھی۔ عرصہ ہوا، پرویز صاحب نے دقیق تاریخی تحقیق کے بعد یہ ثابت کیا کہ شادی کے وقت ان کی عمر سترہ اور انیس سال کے درمیان تھی۔ ان کی یہ تحقیق ان کی کتاب "طاہرہ کے نام خطوط" میں درج ہے۔ بجائے اس کے کہ ہمارا قدامت پرست طبقہ خوش ہوتا کہ اس تحقیق سے اس اعتراض کا مدلل جواب سامنے آگیا ہے جو معاندین حضور نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ کے خلاف عائد کرتے چلے آرہے ہیں، یہ الٹے ان کے گلے پڑ گئے اور اسے انکارِ حدیث قرار دے کر ان کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کر دیا۔

(۲) افسانۂ افک جس کی رو سے یہ حضرات مانتے چلے آرہے ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی عصمت کے خلاف (معاذ اللہ ــــ معاذ اللہ) بہتان لگایا گیا تھا۔ اس واقعہ میں حضرت عائشہؓ کو ملوث کر دینا بڑی ہی لرزہ انگیز سازش تھی۔ لیکن چونکہ اس سازش کو ہماری کتبِ احادیث میں داخل کر دیا گیا اس لئے اس نے "مستند حقیقت" کی پوزیشن اختیار کر لی۔ اس واقعے کے ضمن میں قرآن مجید میں حضرت عائشہؓ کا نام تو ایک طرف اشارہ اور کنایہ تک نہیں پایا جاتا۔ پرویز صاحب نے سیرتِ طیبہ پر اپنی کتاب "معراجِ انسانیت" (تیسرا ایڈیشن صفحہ ۴۸۲) میں اس کی وضاحت کی ہے۔ لیکن ہمارا قدامت پرست طبقہ بدستور مصر ہے کہ یہ واقعہ حضرت عائشہؓ ہی سے متعلق ہے کیونکہ اس کے انکار سے روایات کا انکار لازم آتا ہے۔ یعنی ان حضرات کا مسلک یہ ہے کہ حضور نبی اکرمؐ اور امہات المومنین کی سیرت داغدار ہوتی ہے تو ہو جائے لیکن روایات کا انکار لازم نہ آئے۔

ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ محترم حکیم فیض عالم صدیقی صاحب نے ان اعتراضات سے متعلق بڑی تفصیلی بحث کی ہے اور نہ صرف قرآن کریم کی روشنی میں بلکہ روایات کے تجزیہ کے بعد ثابت کیا ہے کہ یہ تمام اعتراضات سازش کا نتیجہ ہیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے یہ کتاب بیرت فی الجملہ اہمیت رکھتی ہے۔

(۲) اس کے باوجود یہ دیکھ کر ہمیں افسوس ہوا کہ صدیقی صاحب بھی روایات کے گرداب سے پوری طرح نکل نہیں سکے۔ مثلاً وہ اس کے قائل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے نکاح سے پہلے حضرت عائشہؓ کو حضورؐ کے خواب میں دکھایا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ "علم الٰہی میں وہ محبوبۂ محبوبِ رب العالمین ہیں" (صفحہ ۲۱۵) علاوہ ازیں وہ جنگِ جمل کے واقعہ کو بھی صحیح تسلیم کرتے ہیں حالانکہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ (جنگِ جمل اور جنگِ صفین میں) پورے کے پورے صحابہؓ شمشیر بدست ایک دوسرے کو قتل کرنے کے لئے میدانِ کارزار میں اتر آئے تھے تو اس سے ان کی سیرت کا ایسا نقشہ سامنے آتا ہے جو ان کی اس سیرت کے یکسر خلاف ہے جسے خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے۔ پرویز صاحب نے اپنی کتاب "شاہکارِ رسالتؐ" کے ابتدائیہ میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔

۳۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کو بڑی عجلت میں طبع کرایا گیا ہے کیونکہ ترتیب کے اعتبار سے جن امور کو کتاب کے شروع میں آنا چاہیے تھا ان کا اضافہ کتاب کے آخر میں کیا گیا ہے۔ امید ہے کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے وقت اس کا خیال رکھا جائے گا۔

محترم پرویز صاحب کا
درسِ قرآن

بزمِ طلوعِ اسلام ہر ماہ کے پہلے اتوار کو ڈھائی بجے دوپہر (بذریعہ ٹیپ)
لندن (انگلینڈ)
149 SUTTON COURT RD
LONDON E-13 — 9NR.
PHONE 01 — 552-1517

لاہور میں ہر جمعہ ۸ بجے صبح (فون ۸۸۰۸۰۰) ۲۵/ بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس اسٹیشن)	**فیصل آباد** میں ہر جمعہ ۴ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) دفتر چوہدری شاہنواز صاحب۔ عابد سلک انڈسٹریز (فون 30690) عقب اڈہ لاریاں (ماڑی دی جھگی)
کراچی ہر جمعہ کو ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) کتب خانہ بزمِ طلوعِ اسلام۔ کمرہ ۲۴ ہارون چیمبرز الطاف حسین روڈ۔ نیو چالی۔ کراچی ۲	**گوجرانوالہ** میں ہر جمعہ ۳ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) رہائش گاہ چوہدری مقبول شوکت گل روڈ سول لائنز (بالمقابل پرانا ریلوے اسٹیشن)
پشاور میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) برمکان آغا محمد یونس صاحب۔ رفیقی لین صدر۔ بالمقابل وی آئی پی مین گیٹ۔ پشاور سٹیڈیم۔ بارہ روڈ	**گجرات** میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ نیز بروز اتوار ۴ بجے شام بمقام ۱۲/۱/ بی جمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ)
مردان میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) برمکان ڈاکٹر رضا محمد خاں۔ نواب علی روڈ	**جلالپور جٹاں** میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ) دفتر بزمِ طلوعِ اسلام (بازار کلاں)
راولپنڈی میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) جی ۱۶۶۔ لیاقت روڈ	**ملتان** میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ۔ (فون 72071)

لیہ میں ہر جمعہ بعد نماز مغرب۔ رہائش گاہ ڈاکٹر اظہر ملک صاحب۔ سرکلر روڈ (بذریعہ ٹیپ)

کراچی کے خریدار متوجہ ہوں!

کتب خانہ کے اوقات کار حسب ذیل ہیں:۔
ہر روز علاوہ جمعہ:۔ شام ۶ بجے تا ۸ بجے شب
جمعہ:۔ صبح ۹ بجے تا ۱۲ بجے دوپہر

نیز کتب خانہ میں ادارہ طلوعِ اسلام کی مطبوعات بھی دستیاب ہیں اور ایک کارڈ تحریر کر کے منگوائی بھی جا سکتی ہیں۔

محمد اسلام۔ کتب خانہ بزمِ طلوعِ اسلام۔ کمرہ نمبر ۲۴۔ ہارون چیمبرز، الطاف حسین روڈ۔ نیو چالی **۔ کراچی ۲**

قتلِ مُرتد

ہمارے ہاں جو خلافِ قرآن نظریات چلے آ رہے ہیں ان میں ایک نظریہ یا عقیدہ یہ بھی ہے کہ جو مسلمان، اسلام چھوڑ دے، اس کی سزا قتل ہے۔ اسلام چھوڑنے سے مراد یہی نہیں کہ وہ ہندو یا عیسائی ہو جائے۔ اس سے مراد یہ بھی ہے کہ جس مسلمان کے متعلق علماء حضرات کہہ دیں کہ اس کے عقائد صحیح اسلام کے مطابق نہیں رہے (یعنی اس اسلام کے مطابق جسے وہ صحیح سمجھتے ہیں) وہ بھی واجب القتل ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے طلوعِ اسلام کی طرف سے ایک کتابچہ شائع ہوا تھا جس میں اس سراسر خلافِ اسلام نظریہ کے متعلق تفصیلی بحث کی گئی تھی۔ اس کتابچہ میں "اسلام میں غلام اور لونڈیوں" کے متعلق بھی بحث آ گئی تھی۔

اس لحاظ سے اس کا نام تھا

قتلِ مُرتد ـــــ اور ـــــ غلام اور لونڈیاں

چونکہ آجکل قتلِ مُرتد کے متعلق پھر سوالات اُبھر رہے ہیں اس لئے اس کتابچہ کا مطالعہ بہت مفید رہیگا۔ ـــــ قیمت چار روپے، علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام بی ۲۵ گلبرگ ۲ لاہور ـــــ مکتبہ دین و دانش چوک اُردو بازار لاہور

رشتوں کی ضرورت

ایک شریف، معزز، (پنجابی) خاندان کی دو دوشیزگان کے لئے مناسب رشتوں کی ضرورت ہے۔ لڑکیاں، سلیقہ شعار۔ امورِ خانہ داری سے واقف اور مشرقی ماحول کی پروردہ ہیں ـــــ تعلیم کے لحاظ سے۔

(۱) ایم۔ اے (انٹرنیشنل ریلیشنز) پبلک سکول میں پروفیسر ـــــ عمر قریب تیس سال

(۲) بی۔ ایس۔ سی۔ ـــــ عمر قریب بائیس سال

خط و کتابت بصیغہ راز رکھی جائیگی

(ع ر و۔ معرفت ادارہ طلوعِ اسلام۔ بی ۲۵ گلبرگ ۲۔ لاہور)

اسلام کا معاشی نظام

اپریل ۱۹۷۹ء میں کراچی میں، زیرِ اہتمام نیشنل بنک آف پاکستان، ایک مذاکرہ منعقد ہوا جس کا موضوع تھا۔ —— اسلام کا معاشی نظام —— اس کا افتتاح، وفاقی وزیرِ مالیات، محترم غلام اسحٰق خان صاحب نے فرمایا۔ ان کے خطبہ افتتاحیہ سے یہ دیکھ کر ہمیں خوشی ہوئی کہ پاکستان کے اربابِ دانش و بینش کی سوچ کا رُخ اب قرآنِ حکیم کی طرف منعطف ہو رہا ہے، اور اس خیال سے اس خوشی کا احساس اور بھی گہرا ہو جاتا ہے کہ اپنے منصب کے اعتبار سے خان صاحب موصوف جس طبقہ سے متعلق ہیں وہ اس روش کی طرف آ رہا ہے کہ ملک (بلکہ عالم انسانیت) کے اجتماعی مسائل کے حل کے لئے خدا کی اس عظیم کتاب کی راہ نمائی ناگزیر ہے۔ خان صاحب نے اس باب میں جو طرح ڈالی ہے اس کے لئے ہم انہیں دل خوش مبارک باد کہتے ہیں۔ ہم ان کے خطبہ افتتاحیہ کو بمسرت درج ذیل کرتے ہیں۔ اس میں جن آیات کا ترجمہ نہیں دیا گیا، اسے فٹ نوٹ میں درج کر دیا گیا ہے اور جو مقامات ہمارے نزدیک وضاحت طلب ہیں، خطبہ کے حاشیہ میں ان پر نمبر دے دیئے گئے ہیں اور طلوعِ اسلام کے استدراک میں ان نکات کی وضاحت کی گئی ہے۔

خطبۂ افتتاحیہ

نیشنل بینک آف پاکستان کے زیرِ اہتمام منعقدہ اسلام کے اقتصادی نظام کے موضوع پر اس مذاکرے کا افتتاح کرنے کی سعادت میرے لئے باعثِ افتخار ہے۔ تاہم میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ یہ قرعۂ فال میرے نام کیسے نکلا۔ یہ مقام ان علماء اور دانشوروں کا ہے جنہوں نے اپنی زندگی قرآن و حدیث کی روشنی میں ان مسائل کے مطالعہ اور ان پر غور و خوض میں صرف کی ہے۔

حضور رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے:-

مَنْ تَکَلَّمَ فِی الْقُرْآنِ بِغَیْرِ عِلْمٍ فَلْیَتَبَوَّءْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّارِ۔

"بغیر علم کے قرآنی احکام کے متعلق گفتگو کے بارے میں عذاب النار کی اس واضح وعید کے بعد مجھ جیسا انسان جس کا علم اسلامی اقتصادی نظام کے ایک سرسری مطالعہ تک ہی محدود ہے بہت جھجک

اور انکسار کے ساتھ ہی اپنے خیالات کے اظہار کی جرأت کر سکتا ہے۔

۲۔ پاکستان اپنے پیچیدہ اور مختلف النوع مسائل کے حل کرنے کی خاطر اور اپنے صحیح قومی تشخص کو حاصل کرنے کے لئے اسلامی نظامِ حیات کو قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں روبہ عمل لانے کی جدوجہد میں مصروف ہے۔ یہ کوشش ہمارے قومی وجود کو بامعنی بنانے اور ہماری متعینہ منزل کی طرف پیش رفت کے لئے ہی اہم نہیں ہے، اس کے اثرات اور نتائج پر پورے عالمِ اسلام کی توجہ مرکوز ہے۔ اس طرح ہم پر ایک گرانقدر ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ احیاءِ نظامِ اسلامی کا تجربہ جس کی اوّلین صدا پاکستان کے عملی اقدامات ہیں، اس حد تک واضح طور پر کامیاب ہو کہ ناقدین کے لئے مسکت جواب ثابت ہو اور عالمِ اسلام میں ایک ہمہ گیر تحریک کا پیش خیمہ بن سکے۔

۳۔ کامیاب عملی اقدامات کے لئے علم و عمل کی اعلیٰ صلاحیتوں کا مربوط استعمال ضروری ہے۔ ہمارا یہ ایمان ہے کہ اسلام ایک مربوط اور ہمہ گیر نظامِ زندگی ہے اور زندگی کے ہر شعبہ کے لئے صحیح لائحہ عمل پیش کرتا ہے۔ لیکن ہم کو یہ تسلیم کرنے میں بھی تامل نہیں ہونا چاہیئے کہ اسلامی ممالک ایک طویل عرصہ تک انحطاط میں اور غیر اسلامی تسلط کے نیچے رہے اور اس کے نتیجے میں بیشتر اسلامی ممالک میں عملی زندگی کا ناطہ اسلامی اصولوں سے کٹ گیا۔ اسلام کی بنیادی اور ابدی قدروں کے مطابق نئے سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل کے حل، اداروں کے قیام اور قوانین کی تدوین پر توجہ نہ دی گئی۔ نہ صرف عملی زندگی میں بلکہ فکر و علم کی دنیا میں بھی اسلامی قدروں اور بدلتی ہوئی زندگی کی عملی ضروریات کے درمیان فکری رشتہ کو مضبوط کرنے کے لئے اور عملی حالات سے مطابقت کے لئے کام نہ ہوا۔ ایک طرف وہ تعلیم تھی جہاں "منطق" بھی افلاطون کے قول پر ختم ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف وہ تربیت جس نے تعلیم یافتہ طبقہ کو اسلام کی فکری بنیاد سے نا آشنا رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غیر اسلامی فکر، اقدار اور ادارے قومی زندگی پر حاوی ہو گئے۔ اور قوم کا آئیڈیل بن گئے۔ یہ روش اس حد تک عام ہوئی کہ اہلِ کارواں کے دل سے احساسِ زیاں بھی جاتا رہا۔

۴۔ اسی لئے آج جب ہم اسلامی نظامِ زندگی کو اور اس کے ایک جزو کی حیثیت سے اسلامی اقتصادی نظام کو اپنا کر روبہ عمل لانا چاہتے ہیں تو قدم قدم پر مزید تشریح اور اجتہاد کی ضرورت سے دوچار ہوتے ہیں۔ مسائل تخیل کے مرحلے پر بھی ہیں (CONCEPTUAL PLAN) اور عمل کی دنیا سے بھی ان کا تعلق ہے۔ بہترین فکر اور غور کے بعد بھی جو انسانی قوانین بنائے جائیں وہ نامکمل ہی رہیں گے۔ اور ان کو عملی مسائل کی روشنی میں سنوارنے کا کام ہمیشہ جاری رہے گا، لیکن یہ ضروری ہے کہ ہر مسئلہ کے فکری اور عملی پہلو پر پہلے ہی سے کافی غور و خوض ہو اور اس طرح عملی دشواریاں کم کی جا سکیں۔ اکثر مسائل کی پیش بندی اس طرح ممکن ہے کہ نئے دور کے پیچیدہ مسائل کو اسلام کے پیش کردہ اصولوں کی روشنی میں دیکھا جائے اور ایسا لائحہ عمل تیار کیا جائے جس سے کامیابی کی طرف یقینی پیش قدمی ممکن ہو سکے۔ اس وقت جب کہ قوم نے اسلامی قوانین کے نفاذ کی طرف عملی اقدامات شروع کر دیئے ہیں اور مزید اقدامات کی تیاری

جاری ہے ۔ ہر شعبۂ زندگی کے متعلق اس قسم کے سیمینار ہونے ضروری ہیں تاکہ آپ جیسے اہل علم اور دانشور حضرات مناسب بحث و فکر کے بعد نظام اسلام کے مکمل نفاذ کے لئے ایک مربوط لائحہ عمل حکومت کو پیش کر سکیں ۔ مسلسل ذہنی کاوش اور فکر کی تعمیر نو کا یہ عمل ایک مسلسل جہاد ہے اور اسی کے بطن سے انشاء اللہ وہ معاشرہ پیدا ہوگا جو انتشار میں مبتلا انسانیت کو فلاح کی ضمانت دے سکے ۔

۵ ۔ اسلامی اقتصادی نظام کو صحیح معنوں میں سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ سب سے پہلے اقتصادیات کا مقام اسلامی ضابطۂ حیات کی روشنی میں متعین کر لیا جائے ۔ اسلامی معاشرہ افراد کو تسخیر کائنات کے آفاقی مشن کے لئے اور اللہ کی طرف سے عائد کردہ بار امانت اٹھانے کیلئے تیار کرنے کے اعلیٰ و ارفع مقاصد رکھتا ہے ۔ افراد کے ذمہ حقوق اللہ اور معرفت خدا کی ہی ذمہ داری نہیں بلکہ خلافت اللہ کے امین جملہ دیگر افراد معاشرہ کے حقوق کی پہچان اور ادائیگی اور ان کی معرفت بھی اہم ہے کیونکہ انسان کی انسان سے یہ مکمل روشناسی اور اس کی عظمت کا عرفان معاشرہ میں استحصال اور اقتصادی محکومی کو مکمل طور پر بے دخل کرتا ہے اور اس طرح انسانی فلاح کو اس کی انتہا تک پہنچاتا ہے ۔

۶ ۔ اس معاشرہ کی نمو کے لئے معاشی اور اقتصادی ترقی ظاہر ہے کہ لازمی ہیں ۔ لیکن اس طرح کہ ہر فرد کے لئے یہ ممکن ہو کہ وہ اپنی فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر مکمل انسانیت کا نمونہ پیش کرنے کے لئے کوشاں رہے کیونکہ اسی میں اس کی دنیوی اور اخروی نجات ہے ۔ اقتصادی محرومی اور افلاس جو انسانی صلاحیتوں کی تکمیل میں رکاوٹ ہیں اسلامی معاشرہ کے مقاصد سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتے ۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ افلاس و غریبی کفر سے قریب کے خطرہ سے دوچار رہتے ہیں ۔ اسی طرح امارت اور دولت کی ایسی فراوانی جو افراد میں تعیش پسندی اور نخوت پیدا کرے اور اسلامی معاشرے کی تعمیر میں ان کے کردار کو مسخ کر دے ، اسلامی نظام سے مطابقت نہیں رکھتے ۔ لہذا اسلامی معاشرہ ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کے ساتھ مساوات کا بھی علمبردار ہے ۔

۷ ۔ ان اصولوں کی روشنی میں اسلامی اقتصادی نظام معاشیات کو اس کے صحیح مقام پر جانچتا ہے ۔ معاشیات اور معاشی ترقی بذات خود مقصد حیات نہیں بلکہ اصل مقاصد حیات کے حصول کا ذریعہ ہیں بقول رحمان بابا : ؎

" د دلبر و صدقے لا مے ئے غوام ہے ناچہ پہ دنیا پسے زہیریم

(مجھے دنیا کی آرزو دنیا کی خاطر نہیں بلکہ اس لئے ہے کہ دلبروں پہ صدقے کے لئے کچھ مال و دولت ہاتھ رہے) اور اس مجمع کو یہ بتانا چنداں ضروری نظر نہیں آتا کہ رحمان بابا کے دلبر سدا سہاگن راگنیاں گانے والیاں نہیں تھیں ۔ انسان کی اصلی منزل وسائل معاش سے آگے ہے ۔ یہ منزل اسلامی کردار کا فرد اور جماعت میں پیدا ہونا اور اس کے نتیجے میں آخرت کی بہبود ہے ۔ اس لئے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اسلام کا اقتصادی نظام مکمل اسلامی نظام اور مکمل ترین اسلامی ضابطۂ حیات کا ایک جزو ہے ۔ اس مکمل اسلامی نظام کی طرف پیش قدمی کا ایک مرحلہ اسلامی اقتصادی نظام کا قیام ہے ۔

۸۔ اسلامی اقتصادی نظامِ معاشی اور مادی ترقی کے لئے نہ صرف مواقع فراہم کرنے پر زور دیتا ہے بلکہ اکلِ حلال کو بنیادی اہمیت دے کر وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ[1] معاشرہ کی اقتصادی ترقی میں تعمیری شرکت کو لازمی قرار دیتا ہے۔ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى[2]

ساتھ ہی اسلامی نظام نے اس عمل کی حدود بھی متعین کر دی ہیں تاکہ توازن اور عدل کا معیار قائم رہے اور امۃً وسطاً کا صحیح مقصد پورا ہو جائے۔ اسلامی نظام کی بنیاد کلاسیکی اقتصادیات کے وضع کردہ اکنامک مین (ECONOMIC MAN) یا معاشی انسان پر نہیں بلکہ اس انسان پر قائم ہے جو اللہ کی خلافت کا (۱) حق دار بننے کے لئے کوشاں ہے۔

۹۔ آپ صاحبان جب اسلامی اقتصادی نظام کے مختلف پہلوؤں پر موجودہ علمِ اقتصادیات کی روشنی میں بحث کریں گے تو آپ اس بنیادی فرق کو اپنے سامنے رکھیں۔ موجودہ دور کے اقتصادی نظاموں کی بنیاد اس مفروضہ پر قائم ہے کہ انسان کا تمام کردار اور اس کے افعال اور اعمال کا منبع مادی وسائل کے حصول کی خواہش ہے۔ ہر انسان اپنی مادی ترقی کے لئے کوشاں ہے۔ یہی اس کا مطمعِ نظر ہے، یہی مقصدِ حیات۔ سرمایہ داری نظام اس نظریہ پر قائم ہے کہ افراد کی یہ مادی ترقی کی کوشش ایک دوسرے سے ٹکرا کر اگر اجارہ دار بن جائے تو کافی حد تک توازن پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے اور یہ تصادم ہی ترقی کا سبب بن جاتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق اس معاشی جنگ کے سبب جو کچھ افراد کو حاصل ہوتا ہے ان کی غیر مشروط نجی ملکیت بن جاتا ہے، جس پر ان کو مکمل تصرف بلا شرکتِ غیر حاصل ہے۔ دوسری طرف اشتراکیت کا دعویٰ ہے کہ سرمایہ دارانہ معاشرہ کی جماعتوں کا یہ تصادم اس قدر مستقل حیثیت رکھتا ہے کہ مختلف طبقات کا مسلسل برسرِ پیکار رہنا لابدی ہے اور اس کا حل یہ تجویز کیا جاتا ہے کہ تمام ذرائع پیداوار اور افراد کی معاشی زندگی مکمل طور پر حکومت کے فیصلوں کے ماتحت ہو، اس طرح ایک نظام میں مکمل نجی ملکیت کے حقوق اس طرح تسلیم کئے جاتے ہیں کہ معاشرہ بے بس ہو کر رہ جائے۔ دوسری طرف نجی ملکیت کو ختم کر کے اس طرح کی محکومیت پیدا کی جاتی ہے کہ افراد کی تخلیقی اور تعمیری صلاحیتیں پوری طرح اظہار کا موقع نہیں پاتیں۔ بالفاظ دیگر افراط و تفریط میں مبتلا یہ نظام انسان کی مادی وسائل کے حصول کی تمنا کو یا تو بے لگام چھوڑتے ہیں یا اس کو بے بس اور محکومی کے شکنجے میں جکڑ دیتے ہیں۔

۱۰۔ اسلامی اقتصادی نظام کی بنیاد اس کے برعکس تصور پر ہے کہ تمام مادی وسائل اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا[3] اور انہی کی طرف سے انسان کے پاس امانت (۲) ہیں۔ انسان ان پر تصرف کا نگہبان اور ان کی ترقی کا ذمہ دار ہے۔ اس کو نہ اسراف کی اجازت ہے

---

[1] تم اپنا مال آپس میں ناجائز (باطل) طریق سے مت کھاؤ۔ (۲/۱۸۸)
[2] انسان صرف اس کا مستحق ہے جس کے لئے وہ محنت کرے۔ (۵۳/۳۹)
[3] زمین میں جو کچھ ہے خدا نے اس سب کو تمہارے فائدے کے لئے پیدا کیا ہے (۲/۲۹)

اور نہ کسی طرح ان شرائط سے انحراف کی' جن کے تحت یہ امانت اس کے سپرد ہے۔ اِذَآ اَنۡفَقُوۡا لَمۡ یُسۡرِفُوۡا وَلَمۡ یَقۡتُرُوۡا وَکَانَ بَیۡنَ ذٰلِکَ قَوَامًا یہاں بھی ملکیت کا سرمایہ دارانہ تصور نہیں ہے۔ یہاں تک کہ عام اصطلاح میں جس کو ہم ذاتی ملکیت تصور کرتے ہیں اس پر بھی فِیۡۤ اَمۡوَالِہِمۡ حَقٌّ مَّعۡلُوۡمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ ح۲ کی شرط ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ملکیت جو پہلے تو امانت ہو اور پھر اس میں دوسروں کا معلوم حق ہو قطعی ملکیت نہیں ہو سکتی اس پر صرف تصرف ضرور دیا گیا ہے۔ لیکن اس اختیار میں بھی حقوق العباد کی ادائیگی اس قدر اہم قرار دی گئی ہے جتنا اپنی جائز ضروریات کی تکمیل، ناجائز کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ (۳) اسی طرح اسلام میں نہ تو بھی ملکیت کی مکمل نفی ہے اور نہ انسان کی انفرادی صلاحیتوں کو ایک ہمہ گیر اور جابر ریاست کے تحت کیا گیا ہے۔ انفرادی آزادی اور اجتماعی اقتصادی ذمہ داریوں کو حقوق العباد اور حقوق اللہ کی ذمہ داریوں میں سمو کر ایک ایسا توازن پیدا کیا گیا ہے (۴) جس کے لئے مختلف نظام مدتوں سے کوشاں رہے ہیں۔ لیکن اب تک ناکام ہیں۔

۱۱۔ ہماری بدقسمتی یہ رہی ہے کہ اسلامی نظام کی اس شاہراہ پر چلنے والے مسافر اپنے سنگِ میل کے طور پر دوسرے راستوں کے نشان استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ بہت سی الجھنیں اس بات سے پیدا ہوتی ہیں اور اسی وجہ سے متعدد اعتراضات سامنے آتے ہیں۔ کیونکہ لوگ اسلامی معاشرہ کا رد عمل سرمایہ دارانہ یا اشتراکیت پسندی نظام کے تجربے سے جانچنا چاہتے ہیں۔ (۵) میں اتنا عرض کرنا چاہوں گا کہ زکوٰۃ کے بارے میں قرآنین کو مغرب تخلیق کردہ ٹیکس اور محصول کے پیمانہ سے ناپنے کی کوشش محض تضیع اوقات ہوگی اور سودی نظام کے اداروں سے دبتے ہوئے مسترحقوں کی بنیاد پر بلا سودی نظام کے اثرات کو جانچنا مضحکہ خیز۔ اس سلسلے میں یہ کہتے میں بھی میں کوئی تامل محسوس نہیں کرتا کہ بعض اوقات اسلامی نظام کا سود و زیاں بھی ذاتی خود غرضی کی ترازو پر تولا جاتا ہے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی سے یہ فائدہ متصور کیا جاتا ہے کہ فریضہ الٰہی کے ساتھ ساتھ ٹیکس کے بار سے بھی نجات حاصل ہو۔ رند بھی رہیں اور ہاتھ سے جنت بھی نہ جائے، حالانکہ یہاں تک ہدایت کی گئی ہے کہ اگر ضرورت ہے تو تُؤۡخَذُ مِنۡ اَغۡنِیَآئِہِمۡ وَتُرَدُّ اِلٰی فُقَرَآئِہِمۡ ح۳ ۔ اسی طرح سودی نظام کے خاتمے کی تجویز یہ پیش کی جاتی ہے کہ قرضہ تو پہلے کی طرح مل جائے اور کاروباری منافع بھی سودی نظام کی شرح پر قائم رہے، صرف سود نہ دینا پڑے۔ یہ اسلام اور اس کے اقتصادی نظام کے ساتھ صریحاً زیادتی ہے۔ ضروری ہے کہ اس نظام کی روح اور اس کے مقاصد پر نظر رکھی جائے جس کی بنیاد قُلِ الۡعَفۡوَ (کہہ دیجئے کہ سب فالتو مال اللہ کی راہ میں دے دو) پر ہے۔

ح۱ مومنوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں۔ وہ اعتدال کی روش اختیار کرتے ہیں (۲۵/۶۷)

ح۲ (مومنوں کے مال میں) محتاجوں اور محروموں کا حق معلوم ہوتا ہے (۷۰/۲۴-۲۵)

ح۳ ان کے مالداروں سے لے کر محتاجوں کو دو (حدیث)

۱۲۔ مکمل اسلامی نظام کے قیام کی کوششوں کی ذمہ داری فرد، جماعت اور اداروں پر یکساں عائد ہونی چاہیئے۔ تعلیم و تبلیغ اور تزکیۂ افراد کی ماہیت قلب کی طرف اقدامات ہیں۔ ان کی کامیابی کے لیئے ان اداروں کا انہدام جو ذہنوں کی غلط پرورش کر رہے ہیں اور ایسے اداروں کا قیام جو صحیح ماحول پیدا کرنے میں مدد دیں ضروری ہے۔ اسی عمل کو آگے بڑھانے کے لئے اسلامی قوانین کی تدوین، اسلامی حدود کا نفاذ اور اسلامی اقتصادی نظام کے مختلف اجزاء کو بھی روبہ عمل لانا ہے۔ لیکن یہ سب کام ایک مربوط سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ ان کا اثر ایک دوسرے پر ہوگا۔ ان تمام راستوں پر حتی الامکان ایک ہی وقت میں پیش قدمی لازمی ہے۔

۱۳۔ اسلامی اقتصادی نظام کے مقاصد واضح اور متعین ہیں۔ یہ توازن اور عدل کا نظام ہے۔ اسلامی اخوت اور دولت کے حصول کے مساوی مواقع کی فراہمی اور منصفانہ تقسیم قائم کرنے کا نظام ہے۔ اس میں افراد کی صلاحیتوں اور وسائل کے استعمال کی آزادی معاشرہ کی مربوط ترقی کے ساتھ اس طرح منسلک کی گئی ہے کہ انفرادی اور اجتماعی ترقی ایک دوسرے کی معاون ہوں۔ اصولِ عدل، اسلامی سیاسی اور سماجی تنظیم کی بنیادی اساس ہے۔ توازن قائم رکھنے کے لیئے صحت مند معاشی حالات کا ہونا ضروری (۶) ہے۔ اس مقصد کے لئے دولت کی منصفانہ تقسیم اسلامی اقتصادی نظام کے متفقہ مقاصد میں اہم ترین حیثیت کی حامل ہے۔ دولت کی غیر مساوی تقسیم جو اس کے چند ہاتھوں میں ارتکاز کا موجب ہو ناقابلِ برداشت افلاس اور غریبی کو جنم دیتی ہے۔ معاشرہ میں عدم توازن اور انتشار کا سبب بن جاتی ہے۔ دولت کی ایسی غیر مساوی تقسیم ہی قوموں کی جارحیت کو فروغ دیتی ہے تاکہ دوسروں کی محنت اور کفایت کی کمائی پر زبردستی قبضہ کرلیں۔ اس لئے ارشاد ہوا ہے کہ وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ[1]

۱۴۔ غرض یہ کہ عدل، توازن، معاشی ناہمواریوں سے گریز اور دولت کی منصفانہ تقسیم جیسے مقاصد اسلامی اقتصادی نظام کے بنیادی اور غیر متزلزل اصول ہیں اور ان اصولوں کی بنیادی حیثیت نہ جدید دور کے فیشن اور دوسرے معاشروں سے مقابلہ کے طور پر نہیں دے رہا۔ آپ حضرت ابوذر غفاریؓ سے شاہ ولی اللہؒ صاحب کی حجۃ اللہ البالغہ تک ایک مسلسل فکر اسی انداز میں پائیں گے۔ یہ خداوند تعالےٰ کا شکر ہے کہ یہ اسلامی فکر شاہوں کے دور میں بھی قائم رہی اور غیر ملکی تسلط سے بھی محفوظ رہی۔

۱۵۔ مقاصد کے تعین کے ساتھ اسلامی نظام میں ان مقاصد کے حصول کے لیئے راہیں بھی متعین کر دی گئی ہیں۔ اشتراکی نظام میں مقاصد اور حصولِ مقاصد کے طریقوں میں جو منافقانہ تضاد نظر آتا ہے: (THE END JUSTIFIES THE MEANS, NO MATTER WHAT ITS COST IN HUMAN VALUES AND LIVES)

---

[1] جو لوگ چاندی اور سونا جمع کرتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں کھلا نہیں رکھتے (اے رسولؐ)، تو انہیں ایک الم انگیز عذاب کی "بشارت" دیدے۔ (۹/۳۴)

اسلام نے اس کی پیش بندی ابتداء سے ہی کر دی ہے، اس سلسلے میں چار اجزاء نمایاں حیثیت رکھتے ہیں :- (۷)

۱۔ نظامِ زکوٰۃ و عشر

۲۔ حرمتِ ربا

۳۔ تجارتی قوانین

۴۔ قانونِ وراثت

۱۵۔ (الف) اولاً مال و دولت کے حصول اور معاشی جد و جہد کی منصفانہ حدود مقرر کر کے افراد کو اس بات کا پابند کر دیا گیا ہے کہ وہ معاشرہ اور اس کے اقتصادی نظام میں انتشار پیدا کرنے سے گریز کریں۔ حرمتِ ربا کے ذریعے ایسے تمام ذرائع آمدنی کو ناجائز قرار دے دیا گیا جن میں افراد اپنی صلاحیتوں کو قومی پیداوار میں اضافہ کے لئے استعمال کرنے کے بجائے دیگر افراد کی محنت کی کمائی میں حصہ دار بن جانا چاہیں۔ اسی لئے ربا کا موازنہ تجارت سے کیا گیا اور واضح کر دیا گیا کہ کسبِ مال کی جائز شکل، (۸) تجارت اور وہ تمام صورتیں ہیں جن میں تجارت کی خاصیتیں پائی جائیں اور حرام وہ تمام کوششیں ہیں جو بغیر تجارت کے یعنی اجتماعی اقتصادی ترقی میں شریک ہوئے بغیر ارتکازِ دولت کے لئے کی جائیں۔ جو لوگ ربا کو تجارت سے خلط ملط کر کے جواز پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کے لئے واضح اور دو ٹوک جواب موجود ہے :-

وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا[۱]

اور اس سلسلے میں احکام کی قطعیت کو وعیدِ اخروی پر نہیں چھوڑا بلکہ چونکہ معاملہ نظامِ دنیا کا ہے لہذا اس کے خلاف اللہ کی طرف سے جنگ کی وعید دنیا میں بھی دی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ[۲]۔

یہ حکم پورے سودی معاشرے کے خلاف ہے۔ اس کی فلاح ناممکن ہے کیونکہ اس سے اللہ اور رسول کی جنگ اس دنیا میں جاری رہے گی۔ یہ وعید اس قدر سخت ہے کہ اس سلسلے میں یہ معلوم کرنا اور (۹) متعین کرنا ضروری ہے کہ کون کون سی چیزیں "ربا" کے احکام میں آتی ہیں اور کیا چیزیں "تجارت" میں شامل ہو جاتی ہیں۔ یہاں صرف احتیاط ہی کافی نہیں، کیونکہ احتیاط اگر ان حدود سے تجاوز کر جائے اور اس دائرہ کار پر بھی اثر انداز ہو جہاں اللہ کی اجازت سے اسلامی اقتصادی نظام ترقی کے مواقع پیدا کرتا ہے تو یہ بھی اسی قدر ناقابلِ قبول ہے جس قدر سودی نظام کی ترویج، یہ ایسا مسئلہ

ص۱ خدا نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور ربٰو کو حرام کیا ہے۔ (۲/۲۷۵)

ص۲ اے جماعتِ مومنین۔ تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور ربٰو میں سے جو کچھ باقی ہے اسے چھوڑ دو۔ یہ تمہارے دعوئے ایمان کا ثبوت ہو گا۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو پھر خدا اور رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ سمجھو۔ (۲/۲۷۸-۷۹)

ہے جس پر ہمہ انداز فکر سے غور کی ضرورت ہے۔ امید ہے آپ کا یہ سیمینار اس مسئلے کے چند ایسے رُخ پیش کرنے میں کامیاب ہو جائے گا جس پر فوری پیش رفت ممکن ہو۔ اس سلسلے میں آپ کو بہت سے سوالوں کے جواب تلاش کرنا ہوں گے۔ مثلاً کیا موجودہ نظام زر جو افراط زر پیدا کرنے کا ذریعہ بن گیا ہے۔ غیر سودی نظام کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔ موجودہ دور میں جب ایک مقررہ رقم کاغذی نوٹوں کی شکل میں قرض دی جاتی ہے، اس کی قوتِ خرید اشیاء کی شکل میں کچھ ہوتی ہے۔ لیکن جب وہی رقم واپس کی جائے تو اس کی قوتِ خرید وقت گزرنے کے ساتھ کم ہو چکی ہوتی ہے۔ کیا یہ اصل رقم کی مکمل واپسی شمار کی جا سکتی ہے۔ جس کا حق قرآنی حکم میں دیا گیا ہے: فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ اسی طرح یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا قرضوں کا موجودہ نظام اور طرزِ تجارت غیر سودی نظام میں قائم رہنے چاہئیں۔ مضاربت کے نظام میں ایک مسئلہ تو اس امر سے متعلق ہے کہ منافع میں شرکت کے لئے شرح منافع کی توقعات کس معیار پر ہوں۔ دوسرا مسئلہ یہ پیدا ہوگا کہ چھوٹی چھوٹی گھریلو بچتیں جمع کرنے کے لئے کیا ترغیبات مناسب ہوں گی۔ اور کس قسم کے ادارے قائم کرنے ہوں گے۔

۱۶۔ دوئم تجارت کے بھی اصول متعین ہیں بعض کاروبار مثلاً شراب و خنزیر کی بیع شرعاً حرام و قطعی ممنوع قرار دی گئی ہیں۔ ایسے معاملات جن میں دھوکہ اور فریب کا عنصر شامل ہو، وہ بھی ناجائز ٹھہرائے گئے ہیں اور میرے اپنے خیال میں بہت سی اشیاء جن کی خرید کی ترغیب موجودہ دور کے اشتہاری ٹیکنیک کے ذریعے دی جاتی ہے، اسی فریب اور دھوکے کے زمرے میں آتی ہیں۔ کیونکہ اس چہرے کی خوبصورتی کا جو ٹیلی ویژن پر کسی اور کی سریلی آواز میں ایک چیز برائے فروخت پیش کرتا ہے، اس چیز کی اپنی (INTRINSIC WORTH OR BEAUTY) خوبصورتی سے قطعی کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اسی طرح ضروریاتِ زندگی کی اشیاء میں مناسب منافع کے حدود کی نشاندہی کی گئی ہے۔ خرید و فروخت میں صحیح ناپ تول کے پیمانے کے استعمال پر زور دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِينَ الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ ۝ وَإِذَا كَالُوهُمْ أَو وَّزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ ۔

غرض ایک مکمل اخلاقی ضابطہ مقرر کیا گیا ہے۔ ان اصولوں میں سے چند قانون کی شکل میں مدون ہونے ضروری ہیں۔ لیکن اکثر ایسے ہیں جن کے لئے افراد کی اخلاقی تربیت اور اسلامی اصولوں سے ذہنی ہم آہنگی کی ضرورت ہے۔

۱۷۔ سوئم کسبِ حلال و اکلِ حلال کے بعد یہ ضروری قرار دیا گیا کہ باوجود اس متوازن اقتصادی نظام

صلا تم صرف اصل زر کے حق دار ہو۔ (۲/۲۷۹)

صلا اس قسم کی روش اختیار کرنے والوں کے لئے تباہی ہے کہ جب دوسروں سے لیا جائے تو پورا پورا لیا جائے اور جب انہیں دیا جائے تو ماپ اور تول میں ڈنڈی ماری جائے۔ (۸۳/۱-۳)

کے بھی جس حد تک اقتصادی ناہمواری برقرار ہے اس کو دور کرنے کے لئے وہ تمام افراد جن کے پاس اپنی ضروریات پورا کرنے کے بعد پس انداز یا اندوختہ ہوتا ہے ان ضروریات کے لئے سرمایہ فراہم کرنے کی ذمہ داری لیں جو انفرادی طور پر پوری نہیں کی جا سکتیں اور ان افراد کی امداد کے لئے سماجی کوششوں میں حصّہ لیں جو اوّلین دور میں پسماندہ رہ گئے ہیں۔ زکوٰۃ اور عشر کا نظام دولت کو پاک کرنے کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ یہ ایک مسلسل جہاد ہے جس میں افراد پر خود کو دولت کی محبت سے پاک کرنے کی کوشش فرض کر دی گئی ہے۔ (۱۰)

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ[1]۔ یہاں فرد اور معاشرہ کا صحیح ربط قائم نظر آتا ہے۔ فرد اپنی تطہیر کی کوشش میں معاشرہ کی اقتصادی قوت کو بڑھانے کا موجب بنتا ہے اور معاشرہ کی ترقی غرباء و مساکین کی قوتِ خرید میں اضافہ اور اس کی معاشی ترقی میں دوبارہ شمولیت سے ایسا ماحول پیدا کرتی ہے جس میں افراد کو اپنی تجارت میں ترقی اور معاشی ہم آہنگی کے ساتھ اپنی دولت سے صحیح استفادہ کرنے کے مواقع مل جاتے ہیں اس لئے ارشاد ہے کہ زکوٰۃ و صدقات سے مال و دولت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً۔ ایسا کون شخص ہے جو اللہ کو قرضِ حسنہ دے کہ وہ اس کو کئی گنا دگنا کر دے۔

۱۸۔ یہ فلسفہ ۳۰۰ سال کے بعد سرمایہ داری نظام کے ماننے والوں کی سمجھ میں اس وقت آیا جب وہ کساد بازاری کے متعدد حملوں سے خود کو تباہ کر چکے تھے۔ ۱۹۳۱ء کے رلیے کساد بازاری کے حملے (THE GREAT DEPRESSION) کا حل کینیز (KEYNES) کے اصولوں کی بنیاد پر یہی تجویز کیا گیا کہ دولت کی منصفانہ تقسیم کی طرف پیش قدمی ہو اور جمع شدہ دولت کو باہر لاکر خرچ کا سامان کیا جائے۔ سود کی شرح کم سے کم ہو اور حکومت بے کاری اور افلاس کو دور کرنے کی کوشش تیز کرے۔ آپ قرآن کریم کی اس آیت کریمہ پر غور فرمائیں کہ جس میں مال کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کے فوائد سمجھائے گئے ہیں۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۭ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ جو لوگ اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ ان (کے مال) کی مثال اس دانے کی سی ہے جس سے سات بالیں اُگیں اور ہر بال میں سو سو دانے ہوں اور خدا جس کے مال کو چاہتا ہے زیادہ کرتا ہے۔ وہ بڑی کشائش والا اور سب کچھ جاننے والا ہے اب آپ اس کی روشنی میں موجودہ ضربی نظریہ (MULTIPLIER EFFECT THEORY) پر غور کریں تو واضح ہو جائے گا کہ دین و دنیا میں جو فوائد اللہ تعالےٰ نے گنوائے تھے انسانی عقل اب ان کو کسی حد تک سمجھنے کے قابل ہوئی ہے۔

---

[1] تم ہرگز نیکی نہیں حاصل کر سکتے جب تک تم اپنی محبوب ترین متاع کو (خدا کی راہ میں) صرف کرنے کے لئے نہ دیدو۔ (۳/۹۲)

۱۹۔ آخر میں ان تمام عدود میں زندگی گزارنے کے باوجود جب افراد مال و دولت حاصل کر لیں تو ان کی زندگی کے بعد یہ دولت نسل بعد نسل مسلسل غیر متوازن تقسیم کا ذریعہ نہ بن جائے۔ قانونِ وراثت (۱۱) کے ذریعے اس وسیع تقسیم کا انتظام کر دیا گیا۔ اور صدقات کو مزید تقسیم دولت کی ترغیب کا مرکز بنایا گیا

۲۰۔ حکومت نے اس نظام کی ابتداء زکوٰۃ و عشر کے قوانین سے کی ہے۔ آپ کو مجھ سے زیادہ علم ہے کہ اسلامی نظام میں اوّلین اہمیت نماز کے ذریعہ تزکیۂ نفس کو اور اس کے فوراً بعد تزکیۂ مال کو بذریعۂ زکوٰۃ حاصل ہے۔

اسلامی اقتصادی نظام کے دو بنیادی دشمن ہیں۔ اوّلاً لالچ، حرص، طمعِ دنیا اور دوئم خوفِ افلاس کے سبب ناجائز ذرائع سے مال کے حصول کی خواہش۔ زکوٰۃ کا نظام ان دونوں کے لئے ضرب کاری ہے۔ اس طرح معاشرہ کی تطہیر سے معیشت کو ربا کی لعنت سے پاک کرنے کی تیاری ممکن ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھا جائے کہ اسلامی اقتصادی نظام صرف زکوٰۃ و عشر پر مشتمل ہے۔ یہ اسلامی معاشرہ کے قیام کا اوّلین مرحلہ ہے۔ صرف اس کے اجراء سے معاشرہ نہ مطمئن ہو سکتا ہے نہ مکمل اسلامی اقدار کے مطابق ترقی کر سکتا ہے۔ غالباً حسرت موہانی کا شعر ہے کہ

رہے گا محرومِ کامرانی یہ مفلسوں کا ہجوم کب تک
طمانیت دے سکے گی اس کو زکوٰۃ و فطرہ کی رسم کب تک

۲۱۔ میرا مقصد آپ کے سامنے اسلامی اقتصادی نظام کے تفصیلی پہلوؤں کو پیش کرنا نہیں ہے۔ اس عالمانہ محفل میں، میں ایک مسلمان کی حیثیت سے آپ کے پاس یہ تمنائیں لے کر آیا ہوں کہ آپ ہماری رہنمائی فرمائیں گے۔ قوم کے دل میں ایک تڑپ ہے، ایک آرزو ہے، سیاسی طور پر قوم نے اپنی منزل متعین کر لی ہے۔ انتظامیہ اس منزل کی طرف پیش قدمی کے لئے ایک آلہ ہے اور ہمارے دانشور اس راہ کی دشواریوں کو دور کرنے اور رہنمائی کرنے کے لئے ہمارے رہبر ہیں۔ کچھ لوگ اس راہ کی دشواریاں گنائیں گے، ان کا مقصد مخالفت نہ سمجھنا چاہیئے۔ بلکہ بہتر تیاری میں مدد دینا۔ آپ کی اور ہماری کوشش ہونی چاہیئے کہ ان دشواریوں کا حل تلاش کریں تاکہ تبدیلی کم از کم تکلیف کے ساتھ مکمل ہو جائے۔

۲۲۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ افسوس یہ ہے کہ ایک مکمل دور ایسا گذرا ہے جس میں عملی طور پر اسلام کا اثر عام زندگی سے کم ہوتا گیا۔ اجنبی قدروں اور غیر اسلامی طرزِ فکر نے معاشرے پر قبضہ کیا۔ معاشی اور اقتصادی ادارے دیگر نظام ہائے زندگی سے مستعار لئے گئے۔ اسلام کی سرزمین پر غیر اسلامی نظام کا ایک جنگل اگتا رہا۔ اب آپ ان اداروں اور اصولوں پر صرف اسلامی نظام کے پیوند نہیں لگاتے پھریں گے۔ بنیادی انقلابی اور ہمہ جہتی تبدیلیوں کی ضرورت ہے اس کا مکمل نقشہ بھی بنانا ہے اور اس کی عملی شکل میں ترجیحات کا تعین بھی کرنا ہے تاکہ اس منزل کی طرف ترقی کا قدم بہ قدم نقشہ بھی سامنے آجائے۔ ہمارے سامنے فی الحال صرف بنیادی خطوط ہیں۔ ان میں عملی زندگی کا رنگ بھر کر ایک جامع و مکمل تصویر بنانی ہے۔

۲۳۔ ہماری بنیاد قرآن و سنت ہے لیکن ہم آج کی دنیا اور اس کی تکنیکی ترقی کو ترک نہیں کریں گے بلکہ ان کو قرآن و سنت کے مطابق بنائیں گے۔ علم و عقل مومن کی کھوئی ہوئی دولت کے مصداق ہیں۔ اگر آج سائنسی ترقی غیر ممالک کے ہاتھ میں ہے تو ہم یہ نہیں بھلا سکتے ہیں کہ چند صدی قبل انہوں نے یہ ہم ہی سے حاصل کی تھی۔ ہم کو اس ترقی کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لینی ہے۔ اس کو اسلامی اصولوں سے مطابقت دے کر اسلامی معاشرے کا جزو لاینفک بنانا ہے۔ اور موجودہ انتشار زدہ دنیا کو تکنیکی، اخلاقی اور روحانی قدروں کا ایسا امتزاج پیش کرنا ہے جو انسانیت کا رہنما بن جائے۔

۲۴۔ آخر میں، میں آپ حضرات کا ایک دفعہ پھر شکریہ ادا کرنا چاہوں گا کہ آپ نے مجھے اس مذاکرے کے افتتاح کا شرف بخشا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی صلاح و مشورے کی یہ کوششیں کامیابی سے نوازے اور مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ

اور معاملات میں ان سے مشورہ کرو۔ پھر جب تم کوئی فیصلہ کر لو اور پھر قوانین خداوندی کی محکمیت پر پورا پورا بھروسہ کر کے، اس پر عمل پیرا ہو جاؤ۔

استدراک

① خلیفۃ اللہ

ہمارے ہاں اس نظریہ نے کچھ "غلط العوام" کی سی شکل اختیار کر رکھی ہے کہ خدا نے انسان کو اپنا خلیفہ "خلیفۃ اللہ" بنایا ہے۔ یہ تصور بنیادی طور پر قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے خلیفہ کسی کے جانشین Successor کو کہتے ہیں اور جیسا کہ ظاہر ہے، کوئی شخص کسی کا جانشین اس کی عدم موجودگی ہی میں ہو سکتا ہے۔ بلکہ اس کے بعد۔ اور خدا تو ہر جگہ موجود رہتا ہے۔ اس لئے کوئی اس کا جانشین کیسے ہو سکتا ہے؟ قرآن کریم نے انسان کو کہیں بھی "خلیفۃ اللہ" نہیں کہا۔ اسے خدا کا عبد، یعنی محکوم اور تابع فرمان کہا ہے۔ جب حضرت صدیق اکبرؓ خلیفہ منتخب ہوئے تو کسی نے انہیں خلیفۃ اللہ کہہ کر پکارا۔ آپ نے اسے فوراً ٹوکا اور کہا کہ "میں خلیفۃ اللہ نہیں، خلیفۃ الرسول ہوں"۔

قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم سے کہا: اِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً۔ اس لحاظ سے انسان کرۂ ارض پر اپنے سے پہلی کسی آبادی یا آبادیوں کا جانشین (بعد میں آنے والا ہے) ہے خلیفۃ اللہ نہیں

② امانت

قرآن کریم میں دین کے جو اصول دیئے گئے ہیں، وہ ہیں تو الفاظ ہی میں لیکن ان سے مقصود یہ نہیں کہ ان الفاظ کو دہرایا جائے اور اس سے اپنے آپ کو یہ جھوٹا اطمینان دلایا جائے کہ منشائے خداوندی پورا ہو رہا ہے۔

منشائے خداوندی یہ ہے کہ ان اصولوں کو عمل میں لایا جائے۔ مثلاً قرآن کریم میں ہے کہ:۔

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ (۱۲/۴۰) یعنی حکمرانی صرف احکام و قوانین خداوندی کی جائز ہے اور کسی کی نہیں۔ صدرِ اوّل کے مسلمانوں نے عملاً ایسا نظام قائم کیا جس میں حکمرانی صرف قوانین خداوندی کی رائج تھی۔ یہ تھا ان الفاظ کا عملی مفہوم لیکن بعد میں جب دین مذہب میں بدل گیا تو مسلمان ان الفاظ کو تو دہراتے رہے مگر حکمرانی انسانوں کی قائم رہی۔ اگر کسی نے اس تضاد پہ اعتراض کیا تو یہ کہہ کر اپنے آپ کو یا معترض کو فریب دینے کی کوشش کی کہ اس سے مراد یہ ہے کہ کائنات میں حکمرانی خدا کی ہے۔

ہمارے ہاں معاشی نظام وہی چلا آرہا ہے جو ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ خالصتاً سرمایہ دارانہ نظام تھا۔ لیکن اس پہ شریعت کا ٹھپّہ لگا کر اسے اسلامی نظام کہہ کر پکارا گیا۔ اس شرعی نظام کی وجہ سے جائیداد اور مال و دولت پہ بے حد و نہایت ذاتی ملکیت شیرِ مادر کی طرح حلال ہے بشرطیکہ اس میں سے کچھ پیسے بطور صدقہ، خیرات یا زکوٰۃ دے دیئے جائیں۔ زمانے کے تقاضوں نے اب نظامِ سرمایہ داری کو ملعون اور مردود قرار دے دیا ہے اور جن قوموں میں یہ نظام رائج ہے وہ بڑے معذرت خواہانہ انداز میں گفتگو کرتے اور اس کی ایسی ایسی بے سروپا تاویلیں کرتے ہیں جو ان کے پوشیدہ احساسِ ندامت کی غمازی ہوتی ہیں۔ ہمارے ہاں اس سے ایک اور انداز کی الجھن پیدا ہو رہی ہے۔ اس قسم کے الفاظ آج کل آپ کو عام طور پہ سنائی دیں گے کہ اسلام میں نہ نظامِ سرمایہ داری ہے نہ اشتراکی نظام۔ اس کا اپنا ایک مخصوص معاشی نظام ہے۔ لیکن جب اس نظام کی تفاصیل کی طرف آتے ہیں تو انہیں یہ کہے بغیر چارہ ہی نہیں ہوتا کہ اس میں بے حد و نہایت ذاتی ملکیت جائز ہے۔ اس سے یہ حضرات اس الجھن میں گرفتار ہو جاتے ہیں کہ اس تضاد کا حل کیا پیش کیا جائے —— اس تضاد کا کہ اسلام میں بلا حدود ذاتی ملکیت بھی جائز ہے اور وہ نظامِ سرمایہ داری کا حامی بھی نہیں۔ اس کے لئے انہوں نے ایک اصطلاح کا سہارا لے رکھا ہے کہا یہ جاتا ہے کہ مسلمان بے شک ہر قسم کی جائیداد اور مال و دولت بے حد و حساب رکھ سکتا ہے لیکن یہ اس کی ملکیت نہیں ہوتے۔ مالک تو ان سب کا خدا ہوتا ہے لیکن اس کے پاس یہ چیزیں بطور امانت ہوتی ہیں۔

"امانت" کی یہ اصطلاح حال کی وضع یا اختیار کردہ نہیں۔ یہ ہمارے ہاں پہلے سے چلی آرہی ہے۔ آپ نے اکثر قدیم مکانوں کے باہر تختی پہ یہ شعر کندہ دیکھا ہوگا ؎

در حقیقت مالکِ ہر شے خداست　　　این امانت چند روزہ نزدِ ماست

اس کے بعد عملی دنیا کی طرف آئیے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ اس مکان کا مالکِ حقیقی تو خدا ہے لیکن یہ میرے پاس بطور امانت ہے۔ میں اس کا مالک نہیں امین ہوں۔ دوسرا شخص اپنے مکان کے متعلق کہتا ہے کہ میں اس کا مالک ہوں۔ سوال یہ ہے کہ عملی لحاظ سے ان دونوں میں کچھ بھی فرق ہوتا ہے؟ - بالکل نہیں۔ دونوں کو اپنے اپنے مکان کے پورے مالکانہ حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ وہ ان میں خود رہیں۔ کرائے پہ دے دیں، رہن رکھ دیں، فروخت کر دیں، ہبہ کر دیں۔ ان دونوں کو یہ حقوق یکساں حاصل ہوتے ہیں۔ آپ سوچئے کہ جو شخص اسے امانت کہتا ہے اور جو اسے اپنی ملکیت قرار دیتا ہے عملی طور پر ان دونوں میں کچھ بھی فرق ہے؟ —— فرق ہے تو صرف

تاکہ اول الذکر اپنے آپ کو خدا پرستی کا جھوٹا اطمینان دلا لیتا ہے۔ کہا جائے گا کہ اس پر کچھ حدود و قیود عائد ہوتی ہیں۔ مثلاً اسراف نہ کرو۔ تبذیر سے بچو اور واجبات کے سلسلہ میں زکوٰۃ یا خیرات کرو۔ لیکن دوسرے شخص پر بھی اس قسم کی کچھ قیود عائد ہوتی ہیں لیکن ان سے ان کے مالکانہ اختیارات پر کچھ فرق نہیں پڑتا۔

یہ "امانت" کے تصور کی انفرادی مثال تھی۔ اب اس اصطلاح کو اجتماعی نظامِ معیشت میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اسلامی نظام میں بھی (نظامِ سرمایہ داری کی طرح) بے حد و نہایت ذاتی ملکیت کی اجازت ہے۔ لیکن یہ ملکیت نہیں ہوتی۔ امانت ہوتی ہے۔ اور یہی چیز اس نظام کو نظامِ سرمایہ داری سے متمیز کرتی ہے۔ لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کیا عملی طور پر امانت کے تصور سے یہ نظام، نظامِ سرمایہ داری سے متمیز ہو جاتا ہے؟ نظامِ سرمایہ داری کا اصل الاصول بے حد و نہایت ذاتی ملکیت ہے اور یہی اصول (مِن وعَن) اسلامی نظام میں بھی کارفرما رہتا ہے۔ لفظ امانت کے اضافہ سے خوش عقیدگی تو پیدا ہو جاتی ہے لیکن حقیقت نہیں بدل سکتی۔ حقیقت کا ٹیسٹ تو یہ ہے کہ عملاً اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟

قرآن مجید کے معاشی نظام کی عمارت اس معاہدہ پر استوار ہوتی ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَہُمْ وَاَمْوَالَہُمْ بِاَنَّ لَہُمُ الْجَنَّۃَ ...... (۹/۱۱۱)۔ اس معاہدہ کی رو سے مومن اپنی جان اور مال کو خدا کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی چیز کسی کے ہاتھ بیچ دی جائے تو اس پر بیچنے والے کی ملکیت باقی نہیں رہتی۔ اسلامی نظام میں یہ معاہدہ محض نظری اور اعتقادی نہیں رہتا۔ عملی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ کہا یہ جائے گا کہ عملی شکل تو اسی صورت میں وجود میں آسکتی ہے جب خریدار سامنے موجود ہو اور بیچنے والا اپنی چیز کو اس کے حوالے کر دے۔ لیکن خدا تو اس طرح سامنے نہیں آتا۔ اس لئے یہ معاہدہ عملی شکل کس طرح اختیار کرے گا؟ یہاں سے اسلامی نظامِ مملکت کا تصور سامنے آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے سلسلے میں کچھ ذمہ داریاں اپنے اوپر لے رکھی ہیں۔ ان میں بنیادی ذمہ داری، سامانِ نشوونما کا مہیا کرنا ہے۔ وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُہَا (۱۱/۶)۔ "سطحِ ارض پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔" اسلامی نظامِ مملکت خدا کی اس ذمہ داری کو عملاً پورا کرنے کے لئے وجود میں آتا ہے۔ یہی وہ نظام ہے جس کے ساتھ افرادِ معاشرہ وہ معاہدہ استوار کرتے ہیں جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ یعنی وہ اپنا مال اور جان اس نظام کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں اور وہ نظام انہیں سامانِ نشوونما بہم پہنچانے کی وہ ذمہ داری پوری کرتا ہے جسے خدا نے اپنے اوپر لیا تھا۔ اس کی عملی شکل یہ ہے: وَیَسْـَٔلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) یعنی یہ افراد پوری محنت سے رزق پیدا کرتے ہیں اور اس میں سے بقدر اپنی ضرورت کے رکھ باقی سب اس نظام کے حوالے کر دیتے ہیں تاکہ وہ اس سے ربوبیتِ عالمینی کی خدائی ذمہ داری پوری کر سکے۔

یہ ہے قرآن کے معاشی نظام کا عملی خاکہ۔ آپ دیکھیں گے کہ اس میں ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس سے نظامِ سرمایہ داری اپنی جڑ بنیاد سے اکھڑ جاتا ہے۔ دوسری طرف اس میں اشتراکی نظام کا مملکتی استبداد بھی کارفرما نہیں ہوتا کیونکہ یہ نظام وہ افراد بطیبِ خاطر قائم کرتے ہیں جو اس معاہدہ کی رو سے اس

جماعت میں داخل ہوتے ہیں ـــــ یعنی اپنی جان و مال خدا کے ہاتھ بیچ دینے کا معاہدہ۔ صدرِ اوّل میں جب یہ نظام قائم ہوا تھا تو اس میں افراد معاشرہ کی حالت کیا تھی اس کے متعلق ہم تاریخی مثالیں پیش تو کر سکتے ہیں لیکن اس سے سرِ دست احتیاط برتتے ہیں کیونکہ ہماری تاریخ میں (جو دورِ ملوکیت میں مرتب ہوئی تھی) ایسی (وضعی) مثالیں بھی ملتی ہیں جن سے نظام سرمایہ داری کی تائید ہوتی ہے۔ اس بنا پر ہم مثال ایسی پیش کرنا چاہتے ہیں جس کی صحت میں کسی کو بھی انکار نہیں۔ وہ مثال ہے خود حضور نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کی جسے اللہ تعالےٰ نے ہمارے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے۔ اس حقیقت پہ ساری اُمّت متفق ہے کہ حضورؐ کے پاس نہ زمین تھی نہ کوئی اور جائداد۔ نہ مال تھا نہ دولت۔ اپنے اور اپنے اہل و عیال کی ضروریات سے زائد حضورؐ کے پاس کچھ بھی نہیں رہتا تھا' اور اسی وجہ سے حضورؐ نے اپنے ترکہ میں بھی کچھ نہیں چھوڑا تھا۔ یہی اسلامی نظام تھا۔ یہی خدا کے ساتھ معاہدہ کی عملی شکل تھی۔ اور اسی کا نام اتباعِ سنتِ رسولؐ ہے۔ اسی سُنتِ رسول اللہؐ کے اتباع کی طرف طلوعِ اسلام دعوت دیتا ہے اور اربابِ شریعت کی طرف سے "منکرِ سُنت" قرار پاتا ہے۔ بات واضح ہے۔ اگر اس سنتِ رسول اللہؐ کا اتباع کیا جائے تو مروجہ اسلامی نظامِ معیشت کا شائبہ تک باقی نہیں رہتا۔

یہ واضح ہے کہ اس معاشی نظام کے قیام کے بعد' صدقہ، زکوٰۃ، عشر، ربٰو، بنکاری، ٹیکسیز وغیرہ مسائل حل ہی نہیں ہو جاتے' کافور ہو جاتے ہیں۔ یہ سب مسائل ہمارے غیر قرآنی نظامِ سرمایہ داری کے پیدا کردہ ہیں۔ اور ہم اسی نظام کی روشنی میں ان کا حل دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں بُری طرح ناکام رہتے ہیں۔ اگر ہم اس قرآنی حقیقت کا سامنا کر لیں تو پھر تمام اُلجھنیں دور ہو جاتی ہیں۔

(۳) نجی ملکیت

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کے معاشی نظام کی عمارت معاہدہ۔ بیع وشریٰ پر استوار ہوتی ہے جس سے نجی ملکیت کی مکمل نفی ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ نفی کمیونزم کے استبدادی نظام کی پیدا کردہ نہیں ہوتی۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے' یہ نظام افرادِ معاشرہ کا برضاء و رغبت قائم کردہ ہوتا ہے اور جن کے ہاتھ میں اس کا نظم و نسق ہوتا ہے ان کی سیرت خود قرآن اور صاحبِ قرآن کے قالب میں ڈھلی ہوتی ہے۔ اگر یہ نظام وہ ذمہ داری پوری نہیں کرتا جو اس پہ خدا کی طرف سے عائد ہوتی ہے (یعنی جملہ افرادِ معاشرہ کو سامانِ نشوونما مہیا کرنے کی ذمہ داری) تو یہ افرادِ معاشرہ کا زائد از ضرورت مال تو ایک طرف ان سے ایک پائی تک لینے کا بھی حقدار نہیں ہوتا۔ نہ ہی اسے اسلامی نظام کہلانے کا حق حاصل ہوتا ہے۔

(۴) حقوق اللہ اور حقوق العباد

دیگر "اغلاط العوام" تصوّرات کی طرح حقوق اللہ اور حقوق العباد کی تقسیم بھی غیر قرآنی ہے۔ قرآن مجید میں حقوق اللہ کے الفاظ کہیں نہیں آئے۔ اس کی رُو سے خدا حکمران ہے اور انسان اس کا محکوم۔ محکوم' حاکم کے احکام کی اطاعت کرتا ہے۔ اس کے حقوق پورے نہیں کرتا۔ حقوق تو باہمدگر انسانوں کے ہوتے ہیں جن کا پورا کئے جانا ضروری ہے۔

۵ زکوٰۃ

جیسا کہ طلوع اسلام بابت مئی ۱۹۷۹ء کے لمعات میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ زکوٰۃ کے معنی "سامانِ نشو و نما" ہیں اور قرآن کریم نے "ایتاءِ زکوٰۃ ــــ زکوٰۃ دینا" اسلامی حکومت کا فریضہ قرار دیا ہے (۴۱/۲۲)۔ بالفاظ دیگر اس نے کہا ہے کہ اسلامی مملکت کے قیام کی بنیادی غایت اور وجہ جواز یہ ہے کہ وہ افرادِ معاشرہ کو سامانِ نشو و نما مہیا کرے۔ اس سے زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

۶ دولت کی منصفانہ تقسیم

زیر نظر خطبہ میں کہا گیا ہے کہ

اس مقصد کے لئے دولت کی منصفانہ تقسیم اسلامی، اقتصادی نظام کے متفقہ مقاصد میں اہم ترین حیثیت کی حامل ہے۔ دولت کی غیر مساوی تقسیم جو اس کے چند ہاتھوں میں ارتکاز کا موجب ہو۔ ناقابل برداشت افلاس اور غریبی کو جنم دیتی ہے اور معاشرہ میں عدم توازن اور انتشار کا سبب بن جاتی ہے۔

محترم خان صاحب نے بات تو بڑی پتے کی کہی ہے، لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ ان کی نظروں سے "اربابِ شریعت" کا فیصلہ نہیں گزرا۔ دیکھئے کہ وہ اس باب میں کیا فرماتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:-

آپ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے درمیان پوری کائنات میں کسی جگہ بھی یکسانی اور مساوات نہیں رکھی۔ ہر جگہ کسی کو کچھ زیادہ دیا کچھ کم۔ ایک کو ایک معاملے میں کم دیا اور دوسرے کو کسی دوسرے معاملے میں کم دیا۔ کسی کو صحت زیادہ دی کسی کو علم۔ کسی کو دولت زیادہ دی، کسی کو ضعیف جسم، کسی کو حافظہ زیادہ دیا کسی کو بینائی زیادہ دی۔ تمام انسانوں کی قابلیت یکساں نہیں رکھی گئی۔ جس طرح یہ تقسیم فطری ہے اسی طرح رزق کی تقسیم میں بھی مساوات نہیں ہے۔ (مولانا مودودی کی تقاریر۔ حصہ دوم صفحہ ۲۲۳۔ اشاعت اوّل نومبر ۱۹۷۶ء)

(ضمناً) ارباب علم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہوگی کہ یہ دلیل مودودی صاحب کے ذہن کی تراشیدہ نہیں۔ مغربی ماہرین اقتصادیات نظام سرمایہ داری کی تائید میں اسی قسم کی دلیلیں پیش کرتے چلے آ رہے ہیں۔

ہم محترم خان صاحب سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ اگر آپ اسے تسلیم کر لیتے ہیں کہ شریعت کے معاملے میں قولِ فیصل انہی اربابِ شریعت کا ہے، تو رزق کی تقسیم کے بارے میں آپ کا ارشاد مطابق اسلام قرار پائے گا یا مودودی صاحب اور ان کے ہمنوا حضرات کا؟

اسے اچھی طرح سمجھ رکھئے کہ قرآن مجید کی رو سے رزق کی مساوی اور منصفانہ تقسیم سے مراد ہے "ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق۔ نہ اس سے کم۔ نہ زیادہ"۔

۷، ۸، ۹ نظامِ عشر و زکوٰۃ اور قانونِ وراثت

ان امور کے متعلق اجمالاً پہلے لکھا جا چکا ہے۔ بایں ہمہ دو ایک نکات مزید غور طلب ہیں۔ قرآن کریم نے ربوٰ کو حرام قرار دیا ہے اور بیع کو حلال۔ اس ضمن میں سب سے پہلا کرنے کا کام یہ ہے کہ ربوٰ اور بیع کا مفہوم متعین کیا جائے۔ واضح رہے کہ قرآن کریم میں بیع اور تجارت کے الفاظ الگ الگ آئے ہیں اور ربوٰ کے مقابلہ میں بیع کا لفظ آیا ہے۔

تجارت کا نہیں۔ بنا بریں بیع اور تجارت کے مفہوم کی وضاحت بھی ضروری ہے)۔ جہاں تک ربٰو کا تعلق ہے مروجہ قانونِ شریعت کی رو سے مزارعت (یعنی کاشتکار کی پیدا کردہ فصل میں سرمایہ دار کا حصہ) حلال قرار پاتا ہے اسی طرح مضاربت۔ یعنی کاروبار میں صرف سرمایہ لگا کر منافع میں حصہ دار بننا بھی جائز تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کمرشل انٹرسٹ اور بنک کے سود سے متعلق مسائل میں بھی بڑی الجھنیں پیدا ہو رہی ہیں۔ یہ الجھنیں دور نہیں ہو سکتیں جب تک قرآنی اصطلاحات کا مفہوم متعین نہ کیا جائے۔ اور ظاہر ہے کہ جب یہ اصطلاحات قرآن کریم نے استعمال کی ہیں تو ان کا مفہوم بھی قرآن ہی سے متعین کیا جائے گا۔ قرآن اپنے کسی ارشاد کو غیر واضح نہیں رکھتا۔

(۱۰) پھر وہی الجھن

خطبہ میں کہا گیا ہے :-

کسبِ حلال و اکلِ حلال کے بعد یہ ضروری قرار دیا گیا کہ باوجود اس متوازن اقتصادی نظام کے بھی جس حد تک اقتصادی ناہمواری برقرار رہے اس کو دور کرنے کے لئے وہ تمام افراد جن کے پاس اپنی ضروریات پورا کرنے کے بعد پس انداز یا اندوختہ ہوتا ہے ان ضروریات کے لئے سرمایہ فراہم کرنے کی ذمہ داری لیں جو انفرادی طور پر پوری نہیں کی جا سکتیں اور ان افراد کی امداد کے لئے سماجی کوششوں میں حصہ لیں جو اولین دور میں پسماندہ رہ گئے ہیں۔

ہم بصد معذرت عرض کرنے کی جرأت کریں گے کہ اگر اللہ تعالےٰ کے متعین فرمودہ معاشی نظام کے بعد بھی اقتصادی ناہمواری برقرار رہے گی تو پھر انسان اس نظام کو کہاں تلاش کرے گا جس میں اقتصادی ناہمواری نہ رہے ؟ سارا مسئلہ اقتصادی ناہمواری دور کرنے کا ہے۔ اگر اسلامی نظام یہ نہیں کر سکتا تو ہمارا یہ دعویٰ کس طرح حق بجانب قرار پائے گا کہ اسلام نوعِ انسان کی جملہ مشکلات کا حل پیش کرتا ہے۔ ہماری ان الجھنوں کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ذہن میں اسلام کے معاشی نظام کا تصور صاف نہیں ہوتا۔ اس میں موجودہ شرعی نظام کے نقوش ثبت رہتے ہیں۔ افراد کے پاس پس انداز یا اندوختہ ضرورت مندوں کی امداد کے لئے سماجی کوششیں وغیرہ سب انہی نقوش کی جھلکیاں ہیں قرآنی نظام میں انفرادی کوششوں کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اس میں افراد اس نظام کے اجزاء ہوتے ہیں۔

(۱۱) قانونِ وراثت و صدقات

خطبہ میں کہا گیا ہے :-

آخر میں ان تمام حدود میں زندگی گزارنے کے باوجود جب افراد مال و دولت حاصل کر لیں توان کی زندگی کے بعد یہ دولت نسل بعد نسل مسلسل غیر متوازن تقسیم کا ذریعہ نہ بن جائے، قانونِ وراثت کے ذریعے اس وسیع تقسیم کا انتظام کر دیا گیا اور صدقات کو مزید تقسیم دولت کی ترغیب کا مرکز بنایا گیا۔

قرآن مجید کے معاشی نظام کا جو تصور پہلے پیش کیا گیا ہے اس کی رو سے افراد کے پاس زائد از ضرورت دولت رہتی ہی نہیں جو انہیں صدقات کی ترغیب کی ضرورت لاحق ہو یا وراثت کے قوانین ان پہ نافذ کئے جائیں۔ قرآن کریم میں یہ احکام اور قوانین اس عبوری دور سے متعلق ہیں جب قرآن کا معاشی نظام ہنوز مکمل طور پہ قائم نہ

ہوا ہو یہ نظام بتدریج قائم ہوتا ہے۔ اس کی مکمل ترین تصویر حضور نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ میں نظر آتی ہے اسی لئے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

ہم نے محترم غلام اسحاق خان صاحب کے خطاب کے ان چند مقامات کا قرآن کریم کی روشنی میں جائزہ لیا ہے جو ہمارے نزدیک وضاحت طلب تھے۔ جیسا کہ ہم نے شروع میں کہا ہے، خان موصوف کی یہ کوشش درخورِ تبریک و تہنیت ہے کہ انہوں نے عصرِ حاضر کے اہم ترین مسئلہ کے حل کے لئے قرآنی رہنمائی کی طرف رجوع فرمایا ہے۔ اصل یہ ہے کہ قرآن کا معاشی نظام نہ صرف نظامِ سرمایہ داری اور اشتراکی نظام سے متمیز ہے بلکہ وہ اس نظام کی بھی ضد ہے جسے نظامِ شریعت کے نام سے پیش کیا جاتا ہے۔ نظامِ سرمایہ داری اور اشتراکیت سے الگ ہٹ کر سوچنا چنداں مشکل نہیں لیکن جسے نظامِ شریعت کہہ کر پیش کیا جاتا ہے اس کے نقوش کو جنبشِ اوّل میں ذہن سے محو کر دینا ناممکن نہیں تو بعید دشوار ضرور ہے۔ یہ نقوش صدیوں کے تسلسل سے ہمارے تحت الشعور کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو چکے ہیں۔ انہیں وہاں سے نکالنا بڑا صبر آزما اور دقّت طلب مرحلہ ہے۔ اس کے لئے قرآنِ خالص پر گہرے غور و تدبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر محترم خان صاحب نے فی الحقیقت کا یہ ہمت طلب راستہ اختیار کر لیا تو ہمیں یقین ہے کہ قرآنی نظام کی جوئے شیر سے وہ ضرور ہمکنار ہو جائیں گے اور جن اہم ذمہ داریوں کو وہ سنبھالے ہوئے ہیں، ان کے قلب و دماغ کی یہ تبدیلی ایسے انسانیت ساز نتائج پر منتج ہوگی جو اس مملکت کو ان مقاصد سے ہمکنار کر دے گی جن کے لئے اقبالؒ نے اس کا تصور دیا اور قائد اعظمؒ نے اسے حاصل کیا تھا۔

یہ انقلاب ہو تو بجا انقلاب ہو

نظامِ ربوبیت

شائع ہو گئی

(یہ پہلے ایڈیشنوں سے کہیں مختلف ہے)

آپ ایک عرصہ سے سنتے چلے آرہے ہیں کہ اسلام، نہ نظامِ سرمایہ داری کا حامی ہے، نہ کمیونزم کا۔ اس کا اپنا منفرد معاشی نظام ہے جس میں نوعِ انسان کی مشکلات کا حل مضمر ہے۔ لیکن کسی نے یہ نہ بتایا کہ اسلام کا وہ معاشی نظام ہے کیا؟

مفکرِ قرآن، پرویز صاحب کی اس تصنیف میں نہایت وضاحت سے بتایا گیا ہے۔

(۱) نظامِ سرمایہ داری کیا ہے؟ کمیونزم اور سوشلزم کے نظام کیا ہیں۔ اور یہ کیوں ناکام ہو گئے ہیں اور ان کے برعکس (۲) اسلام کا وہ معاشی نظام کیا ہے جو نوعِ انسانی کی مشکلات کا اطمینان بخش حل پیش کرتا ہے —— اس کتاب کے بعد آپ کو معاشیات کے موضوع پر کسی دوسری کتاب کی ضرورت نہیں رہے گی۔

★ کتاب آفسٹ کی چھپائی میں ولایتی سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے —— ضخامت ساڑھے چار سو صفحات —— سنہری جلد —— قیمت فی جلد پچاس روپے محصول ڈاک ۴/-

ملنے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور — مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

حقائق و عبر

۱۔ مرتد کی سزا

ایک صاحب لکھتے ہیں :۔

آج کل مرتد کی سزا کا سوال پھر اٹھایا جا رہا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے مغربی پاکستان کی ہائیکورٹ نے اس موضوع پر ایک اہم فیصلہ صادر کیا جسے طلوع اسلام میں تعارفی نوٹ کے ساتھ شائع کیا گیا تھا۔ اگر اسے دوبارہ شائع کر دیا جائے تو میرے خیال میں مناسب رہے گا۔

طلوعِ اسلام

مغربی پاکستان کا محولہ بالا فیصلہ اور ہمارا تعارفی نوٹ طلوع اسلام بابت دسمبر ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا تھا۔ ملاحظہ فرمایئے :۔

ہمارے ہاں ایک مسئلہ یہ بھی چلا آ رہا ہے کہ اگر کوئی مسلمان اسلام چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کر لے تو اسے قتل کر دینا چاہیئے۔ ہماری مذہبی پیشوائیت کے نزدیک "اسلام چھوڑ دینے" سے مراد یہی نہیں کہ وہ مسلمان کوئی دوسرا مذہب اختیار کر لے۔ اس سے مراد یہ بھی ہے کہ جس مسلمان کے متعلق یہ حضرات کہہ دیں کہ اس کے عقاید صحیح نہیں رہے اور اس طرح اس پر کفر کا فتوے لگا دیں، تو اسے بھی مرتد سمجھا جائے گا اور وہ واجب القتل ہو گا۔ مودودی صاحب اس باب میں اس قدر آگے بڑھ گئے کہ انہوں نے (اپنے کتابچہ ـــــ مرتد کی سزا ـــــ میں) لکھ دیا کہ جب پاکستان میں اسلامی قوانین نافذ ہوں گے تو موجودہ مسلمانوں کو نوٹس دے دیا جائے گا کہ وہ ایک سال کے اندر اندر صحیح اسلامی عقائد اختیار کر لیں (یعنی وہ عقائد جنہیں مودودی صاحب "اسلامی" قرار دیں) ورنہ انہیں (سب کو) قتل کر دیا جائے گا۔

طلوع اسلام نے اس عقیدہ (یعنی مرتد کی سزا قتل) کے خلاف شروع سے صدائے احتجاج بلند کی اور کہا کہ یہ مسلک قرآن کریم کی واضح تعلیم کے یکسر خلاف ہے ـــــ قرآن کے نزدیک ایمان نام ہے حق و صداقت پر دل اور دماغ کی پوری رضامندی کے ساتھ یقین رکھنے کا۔ اس لئے اس میں مذہب کی پوری پوری آزادی ہے۔ اگر کوئی مسلمان (بدقسمتی سے) اسلام چھوڑ کر کوئی اور مذہب اختیار کر لے گا تو وہ اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کی حیثیت سے رہے گا۔ یہ چیز قرآن کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے کہ ایک غیر مسلم کو تو اجازت ہو کہ وہ جی چاہے تو غیر مسلم رہے اور جی چاہے اپنا مذہب چھوڑ کر اسلام اختیار کر لے، لیکن ایک مسلمان کو اس کی اجازت نہ ہو کہ وہ کوئی دوسرا مذہب اختیار کر لے۔ یعنی جو مذہبی آزادی کافر کو حاصل ہے مسلمان پر اس کے دروازے بند ہو جائیں ـــــ

ہمارے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے طلوعِ اسلام کے خلاف جو الزامات عائد کئے جاتے ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ یہ مرتد کو واجب القتل قرار نہیں دیتا۔

مغربی پاکستان کی ہائیکورٹ نے چٹان پریس سے متعلق رٹ درخواست[1] کے فیصلہ (مورخہ ۲۲ جولائی ۱۹۶۸ء) میں قطعاً اس سوال کو بھی لیا ہے (کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے یا نہیں) اور اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس قابل ہے کہ اسے غور سے پڑھا جائے۔ فیصلہ کا متعلقہ حصہ حسبِ ذیل ہے:۔

جہاں تک ان واقعات کا تعلق ہے جن میں . . . . کو مرتد قرار دے کر قتل کر دیا گیا تھا، ہم اس سلسلہ میں صرف اس قدر کہنا چاہتے ہیں کہ یہ مذہبی استبداد کی تأسف انگیز مثالیں ہیں، اور اگر انسانی معاملات میں کوئی خوبی اور شرافت (DECENCY) باقی ہے تو انسانی ضمیر کو اس کے خلاف بغاوت کرنی چاہیئے۔ یہ واقعات، صحیح اسلامی تعلیم اور احکام کے کس قدر خلاف ہیں، اس کی وضاحت سورۂ بقرہ کی آیت ۲۵۶ میں موجود ہے جو نہایت واضح طور پر مذہبی آزادی کی ضمانت دیتی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے ـــــ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ـــــ دین کے معاملہ میں کسی قسم کا جبر و اکراہ نہیں۔ اسی طرح (اسی سورہ کی) آیت ۶۲ میں بھی تمام اہلِ مذاہب کو (مذہبی) آزادی کی ضمانت دی گئی ہے جہاں کہا گیا ہے کہ ـــــ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـُٔوْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ جو لوگ (قرآن پر) ایمان لائے اور جو یہودی کتب مقدسہ کا اتباع کرتے ہیں اور عیسائی اور صابئین ـــــ اور جو لوگ خدا اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں۔ ان کا اجر ان کے رب کے ہاں ملے گا۔ ان پر کسی قسم کا خوف اور حزن نہیں ہوگا۔ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۷۹ میں ایک ایسا متعین حکم ہے جس کی رُو سے کسی انسان کو ـــــ حتیٰ کہ پیغمبر کو بھی ـــــ اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی مرضی کو دوسروں پر زبردستی ٹھونسے۔ (وہ آیت یہ ہے) ـــــ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ـــــ کسی انسان کے لئے جسے خدا نے کتاب اور حکمت اور نبوت عطا کی ہو، (یہ ممکن نہیں) کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں بلکہ میرے پرستار بن جاؤ۔ (اس کے برعکس وہ کہے گا کہ) تم اس خدا کے پرستار بنو جو سب کا پروردگار ہے کیونکہ تم نے کتاب کی تعلیم دی ہے اور اسے اچھی طرح سے سمجھا ہے۔

---

[1] WRIT - PETITION NO. 937 - 1968

[2] اصل فیصلہ میں صرف انگریزی ترجمہ (علامہ یوسف علی) دیا گیا ہے۔ آیات ہم نے خود درج کر دی ہیں۔ ترجمہ وہی دیا گیا ہے جو فیصلہ میں درج ہے۔

فکر و ضمیر کی آزادی کی ضمانت اس سے واضح تر الفاظ میں دی نہیں جا سکتی تھی۔

ہم قرآنِ کریم کی سند و حجت کی بنیاد پر فیصلہ دینے والے ان جج صاحبان کو مستحق تحسین و تبریک قرار دیتے ہیں۔ کس قدر موجبِ اطمینان ہے یہ امر کہ مسلمان اب رفتہ رفتہ پھر سے قرآن کے قریب آ رہا ہے۔ فالحمدللّٰہِ علیٰ ذالک!

طلوعِ اسلام کی طرف سے ایک کتابچہ شائع ہو چکا ہے جس کا نام ہے —— دو اہم مسائل —— غلام اور لونڈیاں اور قتلِ مرتد —— اس میں اس موضوع پر بڑی تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔

۲۔ زکوٰۃ کے متعلق

عشر اور زکوٰۃ کے سلسلے میں حکومت کی طرف سے جو اقدامات کئے جا رہے ہیں، مذہبی جماعتوں کی طرف سے ان کا بڑا خیر مقدم کیا جا رہا ہے۔ قرآنِ کریم کی روشنی میں زکوٰۃ کے صحیح مفہوم کے متعلق طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت مئی میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔ اس مقام پر ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس سے پہلے مروجہ زکوٰۃ کے متعلق جماعتِ اسلامی کا کیا خیال تھا۔ ان کے ماہنامہ ترجمان القرآن کی اشاعت بابت اکتوبر ۱۹۷۱ء میں شیخ یوسف القرضاوی کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا "اسلامی معیشت کی کامیابی کے لئے چند ناگزیر شرائط"۔ اس کا ترجمہ عبدالحمید صدیقی (مرحوم) نے کیا تھا۔ اس میں زکوٰۃ کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا گیا تھا وہ غور طلب ہیں:۔

"فرض کیجئے آج کوئی معاشرہ جو اپنے آپ کو اسلام سے منسوب کرتا ہے، نظامِ زکوٰۃ کو نافذ کرنا چاہتا ہے۔ نتیجہ کیا ہو گا؟ میری رائے میں اس کا نتیجہ مندرجہ ذیل ہو گا:۔

۱۔ اتنی کم مقدار میں زکوٰۃ جمع ہو گی کہ وہ افلاس کا مقابلہ کرنے کے لئے ناکافی ہو گی۔ اس کمی کے کئی اسباب ہیں جن میں سے مندرجہ ذیل دو بڑے اہم ہیں:۔

اوّلاً۔ لوگ حکومت کو زکوٰۃ ادا کرنے سے کترائیں گے۔ کیونکہ حکومت پہلے ہی بہت سے ناقابلِ برداشت قسم کے ٹیکس لگا رکھے ہیں، اور حکومتیں جو زکوٰۃ جمع کریں گی اور کتاب و سنت کی عملداری کا اہتمام نہیں کریں گی ان پر سے لوگوں کا اعتماد اٹھ چکا ہو گا۔ نیز انہیں یہ خیال ہو گا کہ زکوٰۃ کی رقم شریعت کی رُو سے جائز کاموں پر خرچ ہونے کے بجائے محض سیاسی مقاصد کے حصول پر صرف کی جائے گی جیسا کہ اکثر ٹیکسوں کی رقم کی جاتی ہے۔ میرے خیال میں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مسلم معاشرے کے افراد کی ایک کثیر تعداد دینی احکام کی پابندی قبول کرنے کے جذبے اور شعورِ اسلامی سے غیر اسلامی فکری یلغار کے باعث محروم ہو چکی ہے۔

ثانیاً، قومِ مسلم کا بیشتر حصہ ایسا ہے کہ اس کے پاس اتنی دولت یا آمدنی نہیں کہ اس پر زکوٰۃ واجب ہو سکے۔ اور یہ اثر ہے اس طرزِ حیات کا جسے دورِ حاضر کے مسلمان اپنائے ہوئے ہیں۔ وہ طرزِ حیات ہے ان غیر ملکی کفار کا جن کی مسلمان اندھی تقلید کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر وہ سانپ کے بل میں انگلی ڈالیں گے تو یہ بھی ڈالیں گے۔ اور وہ طرزِ زندگی تعیّشات، ظاہری ٹیپ ٹاپ، اور [illegible] اور حرام لہو و لعب میں فضول خرچی اور اسراف پر قائم ہے۔

۲۔ زکوٰۃ کی اس تھوڑی سی مقدار کا ایک حصہ انتظامی پیچیدگیوں اور ظاہری نمود و نمائش پر توجہ دینے کے باعث دفاتر زکوٰۃ، سامانِ نوشت و خواند اور زکوٰۃ کی جمع و تقسیم کے لئے رکھے گئے ملازموں پر خرچ ہو جائے گا۔ یوں زکوٰۃ فقراء و مساکین تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو جائے گی۔

۳۔ چونکہ حکام اور عوام کو اسلامی طرزِ زندگی کی کوئی تربیت نہیں دی گئی۔ اور ان کے قلب و ضمیر کو مسلمان نہیں کیا گیا، لہٰذا تقسیم زکوٰۃ کے وقت گڑبڑ اور دھاندلی ہوگی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اکثر مستحقین زکوٰۃ تو زکوٰۃ سے محروم رہ جائیں گے اور غیر مستحق لوگ زکوٰۃ لے جائیں گے۔

۴۔ آخر کار نتیجہ یہ ہوگا کہ صرف زکوٰۃ سے معاشرے کے جملہ فقراء و مساکین کی ضروریاتِ زندگی پوری نہیں ہوسکیں گی بلکہ ان میں سے صرف وہ تھوڑے سے لوگ ہی زکوٰۃ سے فائدہ اٹھا سکیں گے جنہیں تقسیم زکوٰۃ کے وقت کچھ رقم مل جائے گی۔ اس کے بعد نظامِ زکوٰۃ کے بارے میں عام لوگ شکوہ و شکایت کرتے ہوئے اس کی عدم افادیت کے قائل ہو جائیں گے۔ اور یوں اسلام کے پورے نظامِ زندگی کے بارے میں شکوک و شبہات کی راہیں کھل جائیں گی"۔ یہ تھے جماعت اسلامی کے خیالات زکوٰۃ کے متعلق اس زمانے میں۔

۳۔ مصنوعی اتحاد کا مآل

جس زمانے میں پاکستان قومی اتحاد (پی۔ این۔ اے) کی تحریک کے سلسلہ میں مختلف مذہبی جماعتوں کے اتحاد کو احیائے نظامِ مصطفےٰ کے لئے قلبی یگانگت سے تعبیر کیا جاتا تھا، ہم نے لکھا تھا کہ یہ ان جماعتوں کی قلبی یگانگت کا مظاہرہ نہیں کیونکہ مذہبی فرقوں کے راہنماؤں میں قلبی یگانگت پیدا نہیں ہوسکتی۔ یہ اتحاد اسی قسم کا ہے جس کے متعلق قرآن مجید نے کہا تھا کہ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَّقُلُوبُهُمْ شَتَّىٰ (۵۹/۱۴)۔ "تو انہیں اکٹھا بیٹھے دیکھ کر خیال کرے گا کہ وہ باہمد گر متحد ہیں۔ بالکل نہیں۔ ان کے دل ایک دوسرے سے بالکل الگ الگ ہیں"۔ جب اس متحدہ محاذ کا شیرازہ بکھرا ہے تو قرآن مجید میں بیان کردہ یہ حقیقت محسوس شکل میں سامنے آگئی ہے۔ چنانچہ آج کل ان میں جس انداز سے جل رہی ہے وہ نظارہ بڑا عبرت آموز ہے۔ ان میں سب سے نمایاں (مولانا) نورانی اور جماعت اسلامی کی جنگ ہے۔ اس جنگ میں جماعت اسلامی کس قلبی اضطراب میں مبتلا ہے اس کی ایک جھلک، اس جماعت کے آرگن ترجمان القرآن کی اشاعت بابت جون ۱۹۷۹ء کے اداریہ (اشارات) میں نظر آئے گی۔ اس میں مخالف قوتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

> دوسری مخالف قوت مکفر اور فرقہ باز مولویوں کی ہے جو امت کی وحدت کو پھاڑ کر موجودہ نازک مرحلہ میں دانستہ یا نادانستہ مخالفِ اسلام عالمی سازشی کاروں کی خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔ ان کا مقابلہ کرنے کے لئے مناسب صورتیں یہ ہیں۔ (صفحہ ۵)

یہ وہی مولوی صاحبان ہیں جو متحدہ محاذ میں جماعت اسلامی کے ساتھ تھے۔ اُس وقت نہ یہ مکفر تھے نہ فرقہ باز، نہ ہی یہ امت کی وحدت کو پھاڑ کر مخالف اسلام سازشی کاروں کی خدمت سرانجام دیتے تھے۔ اب جو یہ ان سے الگ

ہوئے ہیں تو انہیں ان خطابات سے نوازا جارہا ہے ۔ ان کے متعلق کہا گیا ہے :۔

جو مذہبی لوگ ملکی اور بین الاقوامی لحاظ سے سنگین پیچیدگی احوال کے باوجود تفرقہ انگیزی کی انتہائی مہلک حکمتِ عملی اختیار کر رہے ہیں وہ یا تو بے حد سادہ لوح اللہ لوگ ہیں یا پھر ان کو مخالف اسلام سازشی قوتوں نے آلۂ کار بنا لیا ہے ۔ براہ راست نہ سہی ، بالواسطہ سہی ۔

ان عالمی قوتوں کے ملتہا دانہ منصوبے کو کامیاب بنانے کے لئے ان کے کارندے یہاں پہلے سے موجود ہیں ۔ سرمایہ دار طبقے میں بھی اور کمیونسٹوں میں بھی ۔ یہ کارندے بڑی چابکدستی سے کسی بزرگ اور اس کے حواریوں کو مسکہ لگاتے ہیں کہ جناب والا ! آپ کی تو بڑی قوت ہے اور سارا دارو مدار آپ ہی پر ہے ، آپ خود آگے بڑھ کر اپنا راستہ بنائیے اور قومی اتحاد یا جماعت اسلامی کو اپنے کندھوں پر پاؤں رکھ کر آگے نہ بڑھنے دیجئے ۔ قومی اتحاد نے تو آپ کو محض اس لئے ساتھ لیا تھا کہ آپ کی طاقت کو اپنے کھاتے میں ڈال کر اس سے کمائی کرے ۔ اور جماعت اسلامی تو اسلام اور پاکستان کے لئے خود ہی بڑی خطرناک چیز ہے ، خدا کے لئے پاکستان کو اس کے چنگل میں پڑنے سے بچائیں ۔

یہ ہے تکنیک جسے کسی بھی حقائق نا آشنا بڑے سے بڑے تفرقہ باز مولوی کو (جس کی نگاہ اس شعوری وجود سے آگے نہیں جاتی جس کا نچلا گھیر ان کے مریدوں پر مشتمل ہے اور جس کی چوٹی ان کی ذات ہے) صاف دکھائی دینے والے مخالفِ اسلام عناصر چپ تحت پر چڑھا دیتے ہیں ۔

ان کی مخالفت کے توڑ کے لئے جو ترکیب تجویز کی گئی ہے وہ بڑی دلچسپ ہے ۔ فرماتے ہیں :۔

یہ حضرات تحریکِ پاکستان کا مرتجیل (CHAMPION) ہونے کا جو ڈھول گلے میں ڈال کر بجا رہے ہیں اس کا پول کھولنے کے لئے ان کے ماضی کے فرمودات اور نگارشات کا کچا چٹھا زور و شور سے لوگوں کے سامنے لایا جائے ۔ جیسے حال ہی میں جسارت کراچی میں کچھ مواد چھپا ہے جس نے حضرت کے بہت سے مریدوں اور غیر مریدوں کو پریشان کر دیا ہے ۔ (صفحہ ۴۶-۴۷)

اگر یہ بزم آرائی ہوئی تو تماشا دید کے قابل ہوگا ۔ جماعت اسلامی اگر اپنے مخالفین کی طرف سے تحریک پاکستان کی مخالفت کی ایک مثال پیش کرے گی ، تو جماعت اسلامی نے جس انداز سے تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی ، ان کے مخالفین اس کی دس مثالیں سامنے لے آئیں گے اور ان کے ان تبروں سے انہیں کہیں پناہ نہیں مل سکے گی ۔

---

۴ ۔ قائد اعظم کو گالی

ہمیں ایک خط موصول ہوا ہے جس میں لکھا ہے :۔

ایک دوست کے ہاں ہفت روزہ "خدام الدین" کا علامہ یوسف بنوری نمبر دیکھنے کا موقع ملا ۔ اداریہ میں کچھ یوں گوہر افشانی کی گئی ہے :۔

(مولانا آزاد کے ، کم ظرف مخالفوں نے انہیں طرح طرح کی گالیاں دیں حتیٰ کہ "شو بائے" تک کہا ۔

آپ جانتے ہیں کہ آزاد صاحب کو "شوبائے" کا خطاب بانی پاکستان حضرت قائداعظمؒ نے دیا تھا۔ گویا قائداعظمؒ (نعوذ باللہ) کم ظرف تھے۔ میرے دوست نے مختلف اخبارات و جرائد سے خطوط کے ذریعے درخواست کی تھی کہ قائداعظمؒ کو دی گئی اس گالی کا نوٹس لیا جائے لیکن قائداعظمؒ ہی کے تشکیل کردہ اس ملک میں اب قائداعظمؒ کی حیثیت ہی کیا رہ گئی ہے کہ کوئی کسی قسم کا نوٹس لینے کی ضرورت محسوس کرتا۔

قائداعظمؒ کی سوئے ادبی کے خلاف ہمارے اس دوست کے دل میں اس قسم کا ردِ عمل بالکل فطری تھا۔ ہر احسان شناس کا اپنے محسن کے متعلق ردِ عمل ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ لیکن ہم اپنے اس عزیز سے کہیں گے کہ وہ ان باتوں کا زیادہ تلخ اثر نہ لیں۔ انہوں نے تو قائداعظمؒ کے خلاف صرف ایک گالی سُنی ہے۔ ہم کیا بتائیں کہ ہمیں اس ضمن میں کیا کچھ سُننا اور اس پر صبر کرنا پڑتا ہے۔ "خدام الدین" دیوبندی حضرات کا ترجمان ہے جس کے سرخیل مفتی محمود صاحب ہیں۔ دیوبندی علماء (باستثناء چند) بانی تحریک پاکستان قائداعظمؒ کے سخت خلاف تھے۔ ان حضرات کو قائداعظمؒ کے ہاتھوں شکستِ فاش ہوئی جس کی وجہ سے اُن کے سینے میں ایسی آتشِ انتقام بھڑکی جو اب تک ٹھنڈی نہیں ہونے پائی۔ یہ اس دن ٹھنڈی ہوگی جب یہ (خاکم بدہن) پاکستان کے جداگانہ وجود کو ختم کر دیں گے کیونکہ اس کا جداگانہ وجود ہی ان کے اور قائداعظمؒ کے درمیان مابہ النزاع تھا۔ لیکن بات تو کچھ اور سوچنے کی ہے۔ قائداعظمؒ کے مخالفین کے جذبۂ مخالفت کی شدت کا یہ عالم ہے اور ان کے نام لیواؤں کی غیرت اور حمیت کی یہ کیفیت کہ یہ ان دشنام طرازوں کے ساتھ دوستی اور محبت کی پینگیں بڑھاتے ہیں۔ لہٰذا افسوس گالیاں دینے والوں پر نہیں آنا چاہیئے۔ گالیاں سُننے والوں پر آنا چاہیئے۔ یہی وہ مقامِ تأسف تھا جس سے متاثر ہو کر غلام قادر روہیلے نے کہا تھا کہ: ؎

حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

ان سے تو قبروں کے مجاور ہزار درجہ اچھے ہوتے ہیں کہ وہ صاحبِ قبر تو ایک طرف اینٹ اور پتھر کی قبر تک کی بے حرمتی کو بھی برداشت نہیں کرتے۔

"طلوعِ اسلام کا اشتراکی نظریہ"

چونکہ ہمارا مروجہ معاشی نظام جسے بدقسمتی سے اسلامی نظام کہہ کر پکارا جاتا ہے ہمارے دورِ ملوکیت کا وضع کردہ ہے لہٰذا انتہائی سرمایہ دارانہ ہے ہماری مذہبی پیشوائیت کی کیفیت یہ ہے کہ جہاں کسی نے "روٹی" کا نام لیا انہیں خطرہ لاحق ہو گیا کہ یہ کمیونزم کے سیلاب کی علامت ہے جو اسلام کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا۔ چنانچہ ایسا کہنے والے کے خلاف یہ دہائی مچا دیں گے کہ وہ کمیونسٹ ہے، ملحد ہے، بے دین ہے۔ اور اگر کہیں اس نے یہ کہہ دیا کہ قرآن مجید میں روٹی کے مسئلہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے تو یہ شور مچا دیں گے کہ یہ اسلام کی تحریف ہے۔ یہ قرآن کی تعلیم کو مسخ کرنا ہے۔ وغیرہ ذالک

اس کی تازہ ترین مثال ہمارے سامنے ہے۔ طلوع اسلام کی اشاعت بابت مئی میں زکوٰۃ کے قرآنی مفہوم کو واضح کرتے ہوئے اس کے معاشی نظام کے نمایاں خط و خال کو بھی سامنے لایا گیا تھا۔ اس میں کہا یہ گیا تھا کہ قرآنی نظام کی رو سے تمام افراد معاشرہ کی ضروریات زندگی کا بہم پہنچانا اسلامی مملکت کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ اس نظام میں کوئی فرد بھوکا نہیں رہ سکتا۔ اور یہ حقیقت حضور نبی اکرمؐ کی اس حدیث کے عین مطابق ہے جس میں کہا گیا ہے کہ :-

جس بستی میں کسی شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا اس بستی سے خدا کی حفاظت اور نگرانی کا ذمہ ختم ہو گیا۔

جماعت اہلحدیث کے ترجمان ہفت روزہ "الاعتصام" کو اس قرآنی نظام میں کمیونزم کا سیلاب ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آیا اور اس نے اپنی ۲۵ مئی اور یکم جون کی اشاعتوں کے اداریہ میں انتہائی غیظ و غضب کا اظہار فرمایا ہے۔ اداریہ کا عنوان ہے :-

"طلوع اسلام" کا انتزاعی نظریہ

(حدیث سے انحراف اور قرآن میں تحریف)

اس میں قرآن کے معاشی نظام کے خلاف کس قسم کے دلائل دیئے گئے ہیں؟ اس کی صرف ایک مثال ملاحظہ فرمایئے۔ کہا گیا ہے کہ "طلوع اسلام میں قرآن کی متعدد آیات میں تحریف کی گئی ہے مثلاً: وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى (۵۳/۳۹-۴۱) - انسان کو وہی ملے گا جو اس کی سعی ہے اور اس کی سعی ضرور دیکھی جائے گی۔ پھر اس کو بدلہ ملنا ہے اس کا پورا بدلہ"

اس کے بعد لکھا ہے :-

یہ آیت آخرت کے متعلق ہے کہ وہاں انسان کو وہی کچھ ملے گا جو اس نے کمایا ہوگا۔ یہ نہیں ہوگا کہ کسی کا بوجھ دوسرے پر ڈال دیا جائے۔ نیز ہر ایک کی سعی و کوشش اس کے سامنے رکھ دی جائے گی اور اس کے مطابق پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ (الاعتصام ۲۵ مئی ۱۹۷۹ء صفحہ ۴)

یعنی ان حضرات کے نزدیک قرآن کریم میں بیان کردہ عدل و انصاف کے تمام اصولوں کا تعلق آخرت سے ہے۔ اس دنیا سے نہیں۔ بالفاظ دیگر :-

(۱) آخرت میں تو ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا پورا بدلہ ملے گا لیکن اس دنیا میں ہر ایک کو چھٹی ہوگی کہ وہ دوسروں کی محنت کا جس قدر استحصال کر سکتا ہے کرے۔ اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔

(۲) آخرت میں تو یہ اصول کارفرما ہوگا کہ کسی کا بوجھ کسی دوسرے پر نہیں لادا جائے گا لیکن اس دنیا میں ہر صاحب قوت کو اس کا حق حاصل ہوگا کہ وہ جس قدر جی چاہے اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ دوسروں پر لادتا چلا جائے۔

اس ایک مثال سے آپ قرآن کریم میں بیان کردہ دیگر اصول اور قوانین کا اندازہ لگا لیجئے یعنی قانون کی حکمرانی۔ ہر ایک سے عدل و انصاف کی تاکید، مظلوم کی داد رسی، کمزور کی حفاظت، طبقاتی ناہمواریوں کا استیصال۔ احترام آدمیت وغیرہ تمام اصولوں کا اطلاق اُخروی زندگی میں ہوگا۔ اس دنیا کی زندگی سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

یہ ہے ان حضرات کے پیش کردہ اسلام کا تصور۔

ہم نے لکھا تھا :-

قرآن کے معاشی نظام میں ہر فرد محنت کرتا ہے۔ اس کے ماحصل میں سے بقدر اپنی ضروریات کے لے کر باقی سب بطیبِ خاطر نظامِ مملکت کی تحویل میں دے دیتا ہے تاکہ وہ اس سے عالمگیر ربوبیت کا فریضہ سرانجام دے۔

یہ تو ان حضرات کے نزدیک خلافِ اسلام ہے اور مطابق اسلام یہ ہے کہ ہر شخص کو اجازت ہے کہ وہ بیحد نہایت دولت جمع کرے۔ بلا تحدید جائدادیں کھڑی کرے۔ کارخانے تعمیر کرے۔ ہزاروں ایکڑ زمین کے رقبوں کا مالک بن جائے۔ اور سال کے بعد اس میں سے چند ٹکے خدا کے نام پر الگ کر دے۔

ہم ان حضرات سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ بتائیں کہ خود نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کون سے اسلام کی حامل تھی؟

(۱) کیا حضورؐ بے حد و نہایت دولت کے مالک تھے یا ضرورت سے زیادہ ایک پیسہ بھی اپنے پاس نہیں رکھتے تھے؟

(۲) کیا حضورؐ نے اپنی زندگی میں کبھی وہ زکوٰۃ ادا کی تھی جو ہمارے ہاں مروج چلی آ رہی ہے؟

(۳) کیا حضورؐ نے اپنے لئے جائدادیں کھڑی کر رکھی تھیں اور آپ لامحدود زمین کے رقبوں کے مالک تھے یا سکتی حجروں کے سوا حضورؐ کا کوئی مکان نہیں تھا۔ اور ایک مربعہ زمین بھی حضورؐ کی ملکیت میں نہیں تھی۔

(۴) کیا حضورؐ نے اپنے ترکہ میں مال و دولت، زمینیں اور جائدادیں اپنے ورثاء کے لئے چھوڑی تھیں یا اس ترکہ میں ایک پیسہ بھی نہیں تھا؟

ان سوالات کا جو جواب آپ کی طرف سے ملے گا، ظاہر ہے کہ وہی صحیح اسلام ہوگا اور اسی کا اتباع، اتباعِ سنتِ نبویؐ۔ دنیا دیکھے گی کہ یہی وہ اسلام ہے جسے طلوعِ اسلام پیش کرتا ہے اور آپ اسے محرّفِ قرآن اور منکرِ سنتِ رسولؐ اللہ قرار دیتے ہیں۔

ضمناً "الاعتصام" نے یہ بھی لکھا ہے :-

حدیث شریف کی رو سے تو صلوٰۃ کا مفہوم بھی متعین ہے اور زکوٰۃ کی صورت بھی مقرر جس کی پشت پر اُمّتِ مسلمہ کا چودہ سو سالہ عملی تواتر بھی موجود ہے۔ ان کا انکار کیونکر کیا جا سکتا ہے؟ چنانچہ اس کے بعد اسلام کو مسخ کرنے کا راستہ ان کے لئے کھل گیا ہے۔ اب پرویزی "قرآنی مفہوم" کی رو سے نہ نماز کا مطلب وہ ہے جس پر چودہ سو سال سے مسلمان عمل کرتے آ رہے ہیں۔ اور نہ زکوٰۃ کا وہ مطلب جو مسلمان انفاقِ مال کی ایک متعین صورت سمجھتے آئے ہیں۔

زکوٰۃ کے متعلق آگے چل کر بات ہوگی۔ جہاں تک نماز کا تعلق ہے کیا آپ پرویز صاحب کی ہزارہا صفحات پر مشتمل تحریروں میں کسی ایک مقام پر بھی یہ دکھا سکتے ہیں کہ انہوں نے نماز کے اُس طریق سے الگ کوئی طریقہ تجویز کیا ہو جو اُمّت میں مسلسل چلا آ رہا ہے (یا چلے آ رہے ہیں) یا کوئی نیا طریقہ وضع کیا ہو۔ اس کے برعکس ہم بکثرت ایسے مقامات دکھا سکتے ہیں جس میں انہوں نے ان طریقوں میں کسی قسم کے رد و بدل یا کسی نئے طریقے کے وضع کرنے

کی سختی سے مخالفت کی ہے۔ ان تصریحات کی روشنی میں سوچئے کہ آپ نے پرویز صاحب کے خلاف کس قدر سنگین بہتان کا افترا کیا ہے۔ خدا اور اس کے رسولؐ کی بارگاہ سے اس قسم کے بہتان کی جو وعید ملتی ہے اس سے یقیناً آپ واقف ہوں گے۔ خدا کے لئے جوشِ مخالفت میں اپنی عاقبت تو خراب نہ کیجئے۔

جہاں تک زکوٰۃ کا تعلق ہے الاعتصام نے کہا یہ ہے کہ اس کے انصاب وغیرہ کی جو متعین شکل چلی آ رہی ہے اس میں کسی قسم کی تبدیلی خلافِ سنتِ رسول اللہؐ اور اسلام میں تحریف ہے۔ الاعتصام نے طلوعِ اسلام کی جس اشاعت کو اپنی تنقید کا ہدف بنایا ہے (یعنی مئی ۱۹۷۹ء) اس کے صفحہ ۱۶ پر خود جماعت اہلِ حدیث کے دوسرے ترجمان اہلحدیث کا ایک اقتباس دیا گیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ زکوٰۃ کا نصاب وغیرہ جس زمانہ میں مقرر کیا گیا تھا موجودہ زمانے کے حالات اُس زمانے کے حالات سے مختلف ہیں اس لئے ان میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اسی صفحہ پر رابطہ عالم اسلامی (جو ایک اہلِ حدیث حکومت کا تنظیمی ادارہ ہے) کے ایک مقالہ کا اقتباس شائع ہوا ہے جس میں زکوٰۃ کی مروجہ تفصیلات میں تبدیلی کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔

جریدہ الاعتصام کو نہ تو اہلحدیث کی تجویز میں تحریفِ دین یا اختلافِ سنتِ رسول اللہؐ کی کوئی جھلک دکھائی دی ہے اور نہ ہی رابطہ عالم اسلامی کے نظریہ میں کمیونزم کی کوئی رمق۔ اسے تحریفِ دین، اختلافِ سنتِ نبویؐ اور کمیونزم کی شعلہ فشانیاں دکھائی دی ہیں تو صرف طلوعِ اسلام میں۔ اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہے کہ اہلحدیث اور رابطہ عالم اسلامی کا تعلق الاعتصام کی اپنی برادری سے ہے اور طلوعِ اسلام قرآن مجید کی روشنی میں فرقہ وارانہ عصبیت کو شرک سمجھتا ہے۔

الاعتصام نے یہ بھی لکھا ہے کہ جس مفہوم کی پشت پر اُمتِ مسلمہ کا چودہ سو سالہ عملی تواتر بھی موجود ہے اس کا انکار کیونکر کیا جا سکتا ہے۔

ہم ان سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر اُمت کا عملی تواتر دین میں سند کی حیثیت رکھتا ہے تو آپ مسلکِ اہلِ فقہ سے اختلاف کیوں رکھتے ہیں جسے اُمت کی اکثریت کا عملی تواتر حاصل ہے؟

قرآنی قوانین

پرویز صاحب کی یہ تازہ ترین تصنیف

جس میں آیات کے ساتھ مفہوم بھی دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ قرآن کریم ایک مسلمان کی زندگی کے لئے کون سی حدود و ضوابط مقرر کرتا ہے۔ ملک میں بے حد مقبول ہو رہی ہے اور اس کی افادیت نکھر کر سامنے آ رہی ہے۔ اس سے نظر آتا ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن جلد ختم ہو جائے گا۔ اگر آپ نے اسے ابھی تک حاصل نہیں کیا تو جلدی منگوا لیجئے۔ قیمت فی جلد (مجلد) بیس روپے (علاوہ محصول ڈاک)

(۱) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور۔ (۲) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

دُرِ منثور

اس گہر ہائے تابدار میں سے چند جو اقبالؒ کے مکتوبات و
دیگر تحریراتِ نثر میں سے جا بجا بکھرے پڑے ہیں ۔

داخلی انقلاب

زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو۔ اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ (دیباچہ پیام مشرق)

نسل پرستی

تاریخ انسانیت میں اسلام کا ظہور ایسے وقت میں ہوا جب وحدتِ انسانیت کے لئے وقیانوسی اصول مثلاً خونی رشتے اور تخت و تاج کے علائق ناکام ہو رہے تھے۔ چنانچہ اسلام کے نزدیک وحدتِ انسانیت کا اصول گوشت پوست سے متعلق نہیں بلکہ اس کا سرچشمہ انسانی قلب میں ہے۔ انسانیت کے نام اسلام کا عمرانی پیغام یہی ہے کہ نسلی امتیازات مٹا دو، ورنہ خانہ جنگی میں تباہ ہو جاؤ گے۔ یہ کہنا مبالغہ آمیزی نہ ہوگا کہ اسلام فطرت کے نسل ساز مظاہر کو پسند نہیں کرتا اور اپنے مخصوص اداروں سے ایسے نقطۂ نگاہ کی تخلیق کرتا ہے جو فطرت کے نسل ساز قومی کو بیکار کر دے۔ انسانوں کے سدھارنے کے لئے اسلام نے ایک ہزار سال میں وہ کچھ کر دکھایا جو عیسائیت اور بدھ مت سے دو ہزار سال سے اوپر میں بھی نہیں ہو سکا۔ (احمدیت سے متعلق۔ نہرو کے جواب میں)

قومیت

اسلام کا مذہبی نصب العین اس معاشری نظام سے ناقابلِ شکست طریق سے وابستہ ہے جسے اس نے تشکیل کیا ہے۔ یہاں تک کہ ایک کا انکار دوسرے کے انکار کو مستلزم ہے۔ لہٰذا قومی خطوط پر کسی ہیئتِ اجتماعیہ کا قیام اسلامی اصولِ وحدت کا نقیض ہے۔ کوئی مسلمان اس کا تصور تک نہیں کر سکتا۔ (خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء)

مذہب اور سیاست

اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح کا داعی نہیں بلکہ عالمِ بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے، جو اس کے قومی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ قدیم زمانے میں دین قومی تھا۔ جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا۔ بعد میں نسلی قرار پایا جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی۔ نہ انفرادی ہے نہ پرائیویٹ۔ بلکہ خالصتہً انسانی ہے۔ اور اس کا مقصد، باوجود تمام فطری امتیازات کے، عالمِ بشریت کو متحد و

منظم کرتا ہے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے عالمِ انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے، جو ایک اُمّت کی تشکیل اور اس کی بقاء کے لئے ضروری ہے۔ (مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں بیان ۱۹۳۸ء)

شریعت کا مقصود

اسلام نفسِ انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا بلکہ ان کے عمل کے لئے حدود معیّن کرتا ہے۔ ان حدود کے معیّن کرنے کا نام اصطلاحِ اسلام میں شریعت یا قانونِ الٰہی ہے۔ (مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط۔ ۱۹۳۶ء)

دورِ انحطاط کے پیغمبر!

اقوام و ملل کے عروج و زوال کی داستانوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قوموں کی زندگی کی سوتیں خشک ہونا شروع ہوتی ہیں تو ان کا زوال بجائے خود ان کے شعراء فلاسفر۔ سیاسیئن وغیرہ ہم کو ایک نئی تحریکِ خیال سے اُبھارتا ہے چنانچہ وہ پیغمبرانہ شان سے اٹھتے ہیں اور استدلال کے گورکھ دھندے تیار کر کے حیاتِ ملّی کے رذائل و ذمائم کے گیت گاتے اور انہیں خوش آیند و درخشاں بتاتے ہیں۔ یہ پیغمبر غیر شعوری طور پر قنوطیت کو رجائیت کے دلفریب لباس میں پیش کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اہلِ قوم کے عملی قویٰ کو شل، اور ان کی روحانی قوّتِ نمو کو یکسر فنا کر دیتے ہیں۔ (بیان متعلقہ احمدیت)

مجوسی کلچر

جب کسی کلچر میں علاماتِ زوال نمودار ہونا شروع ہو جاتی ہیں تو اس کی فلسفیانہ بخشیں۔ اس کے تصوّرات اور اس کے وارداتِ روحانی کی شکلیں جامد اور غیر متحرک ہو جاتی ہیں۔ مجوسی کلچر ایسے ہی دَور سے گزر رہی تھی کہ اسلام کا ظہور ہوا۔ جہاں تک میں تاریخ کلچر کا مطالعہ کر سکا ہوں، اسلام نے مجوسی کلچر کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ قرآن میں بیّن ثبوت اس امر کے ملتے ہیں کہ قرآن کا مقصد یہ تھا کہ وہ نہ صرف فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دے بلکہ وارادات و کیفیاتِ روحانی کی تشکیلِ نو کرے۔ لیکن ہمارے مجوسی ورثہ نے اسلام کی زندگی کی سوتیں خشک کر دیں اور اس کی روح کی نشو و نما اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے سلسلے کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ (احمدیت سے متعلق ـــ اخبار لائٹ کے جواب میں)

اسلام پر نازک وقت

اسلام اس وقت زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔
(صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے نام خط۔ ۱۹۲۵ء)

قرآن کی کاملیت

ایک مدّت سے ہم یہ سُن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادتِ انسانی کے لئے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں۔
(صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے نام خط۔ ۱۹۲۵ء)

دَورِ حاضر کا مجدّد

میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانہ حال کے جورس پروڈنس (اصولِ فقہ) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا۔ وہی اسلام کا مجدّد ہو گا اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہو گا۔ (صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کے نام خط۔ ۱۹۲۵ء)

محاورۂ عرب

ہندی مسلمانوں کی بڑی بدبختی یہ ہے کہ اس ملک سے عربی زبان کا علم اٹھ گیا ہے۔ اور قرآن کی تفسیر میں محاورۂ عرب سے بالکل کام نہیں لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ملک میں قناعت اور توکل کے وہ معانی لئے جاتے ہیں جو عربی زبان میں ہرگز نہیں۔

(سراج الدین پال کے نام خط۔ ۱۹۱۶ء)

ملت کی حالت

اسلام کے لئے اس ملک میں نازک زمانہ آرہا ہے۔ جن لوگوں کو کچھ احساس ہے ان کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کے لئے ہر ممکن کوشش اس ملک میں کریں۔ علماء میں مداہنت آگئی ہے۔ یہ گروہ حق کو کہنے سے ڈرتا ہے۔ صوفیاء اسلام سے بے پرواہ اور حکام کے تصرف میں ہیں۔ اخبار نویس اور آج کل کے تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں اور ذاتی منفعت و عزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں۔ عوام میں جستہ جستہ موجود ہے مگر ان کا کوئی بے غرض رہنما نہیں۔

(چودھری نیاز علی خاں کے نام خط۔ ۱۹۳۷ء)

نازک وقت

مسلمانوں پر اس وقت (دماغی اعتبار سے) وہی زمانہ آرہا ہے جس کی ابتداء یورپ کی تاریخ میں لوتھر کے عہد سے ہوئی۔ مگر چونکہ اسلامی تحریک کی کوئی خاص شخصیت راہ نما نہیں ہے اس واسطے اس تحریک کا مستقبل خطرات سے خالی نہیں۔ نہ عامۃ المسلمین کو یہ معلوم ہے کہ اصلاح لوتھر نے مسیحیت کے لئے کیا کیا نتائج پیدا کئے ہیں۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۲۶ء)

اضطراب

میرے دل میں ممالک اسلامیہ کے موجودہ حالات دیکھ کر بے انتہا اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔ یہ بے چینی اور اضطراب محض اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل گھبرا کر کوئی اور راہ اختیار نہ کرلے۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۲۶ء)

فکر سے محرومی

قومیں فکر سے محروم ہو کر تباہ ہو جاتی ہیں۔

(خطبۂ صدارت ۱۹۳۲ء)

لیڈروں کا فقدان

اس وقت (ہندوستان کے) مسلمان دو امراض میں مبتلا ہیں۔ پہلا مرض ان قائدین کا فقدان ہے جو اسلام کی روح اور تقدیر کو بھی بخوبی سمجھتے ہوں۔ اور تاریخ جدید کے میلانات پر بھی ان کی نگاہ ہو۔ ایسے اشخاص ہی قوموں کی قوت متحرکہ ہوتے ہیں۔ لیکن وہ خدا کی دین ہوتے ہیں اور ضرورت کے مطابق پیدا نہیں کئے جا سکتے۔ دوسرا مرض احساس اجتماعیت کا فقدان ہے۔ اس سے افراد اور گروہ اپنی جداگانہ راہیں تلاش کر رہے ہیں اور عمومی فکر اور اجتماعی حرکت میں کوئی اضافہ نہیں کر رہے۔ اس وقت ہم سیاست میں وہ کچھ کر رہے ہیں جو مذہب میں صدیوں سے کرتے چلے آرہے ہیں۔

(خطبۂ صدارت ۱۹۳۰ء)

احترام آدمیت

انسان کی بقاء کا راز انسانیت کے احترام میں ہے۔

(ریڈیو تقریر ۱۹۳۸ء)

وحدتِ انسانیت

قومی وحدت ہرگز قائم و دائم نہیں ہے۔ وحدت صرف ایک معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے جو نسل، زبان، رنگ اور قومیت سے بالاتر ہے۔
(خطبۂ صدارت ۱۹۳۸ء)

قومیت سے بلند

اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالکِ مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافیائی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قومی انسانی سیرت کی تجدید و تخلیق ہو قابلِ احترام ہے۔ (دیباچہ پیامِ مشرق)

وطنیت

میں یورپی تصورِ کی وطنیت کا مخالف ہوں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس سے مسلمانوں کو کم تر مادی فوائد حاصل ہوں گے۔ بلکہ اس لئے کہ اس میں منکرِ خدا مادیت کے جراثیم پائے جاتے ہیں جسے میں جدید انسانیت کے لئے عظیم ترین خطرہ سمجھتا ہوں۔
(خطبۂ صدارت ۱۹۳۲ء)

مسلم لیگ کے لئے فیصلہ

مسلم لیگ کو آخر کار یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ بدستور سابق مسلمانوں کے اعلیٰ طبقہ کی نمائندگی تک محدود رہے گی یا مسلمان عوام کی نمائندگی بھی کرے گی۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ جو سیاسی جماعت عام مسلمانوں کا درجہ بلند کرنے کی داعی نہیں وہ عوام میں کبھی مقبول نہیں ہو سکتی۔
(قائدِ اعظمؒ کے نام خط ۱۹۳۷ء)

لیگ کا مستقبل

آئین کے مطابق اعلیٰ عہدے امراء کی اولاد کے لئے وقف ہیں اور نچلے درجے کے عہدے وزیروں کے دوستوں اور رشتہ داروں کا حصہ ہیں۔ دیگر امور میں ہمارے سیاسی اداروں نے عامۃ المسلمین کا عمومی درجہ بلند کرنے کا کبھی خیال تک نہیں کیا۔ پیٹ کا مسئلہ دن بدن لاینحل ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمان نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ وہ دو سو سال سے ذلیل سے ذلیل تر ہوتا جا رہا ہے۔ سوال یہ ہے مسلمان کے افلاس کا مسئلہ کیسے حل کیا جائے۔ لیگ کا سارا مستقبل اس مسئلہ کے حل پر منحصر ہے۔ اگر لیگ اس مسئلہ کے حل سے قاصر رہی تو مجھے یقین ہے کہ عوام اس سے دور رہیں گے۔ خوش قسمتی سے اس کا حل اسلامی آئین کی تنفیذ میں ہے۔ طویل غور و فکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس طرزِ آئین کو کما حقہ سمجھ کر نافذ کر دیا جائے۔ تو کم از کم ہر ایک کا حقِ معیشت محفوظ ہو جاتا ہے۔ موجودہ زمانے کے پیدا کردہ مسائل کا حل ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کے لئے زیادہ آسان ہے۔
(قائدِ اعظمؒ کے نام خط ۱۹۳۷ء)

مغربی سیاست

جن نام نہاد مدبرین کو انسانوں کی قیادت اور حکومت سونپی گئی تھی۔ وہ خونریزی، سفاکی، کمزوری اور ظلم کے دلیر ثابت ہوئے۔ جن حاکموں کا یہ فرض تھا کہ اخلاقِ انسانی کے قوامیس عالیہ کی حفاظت کریں، انسان کو انسان پر ظلم کرنے سے روکیں اور انسانیت کی ذہنی اور عملی سطح کو بلند کریں۔ انھوں نے ملوکیت و استعمار کے جوش میں لاکھوں۔ کروڑوں مظلوم بندگانِ خدا کو ہلاک و پائمال کر ڈالا۔ صرف اس لئے کہ ان کے اپنے مخصوص ہوا و ہوس کی تسکین کا سامان بہم پہنچائے۔
(ریڈیو تقریر ۱۹۳۸ء)

تاریک ترین دور

اس زمانہ میں ملوکیت کے جبر و استبداد نے جمہوریت، اشتراکیت، فسطائیت اور خدا جانے اور کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں۔ اور ان نقابوں کے نیچے دُنیا بھر کے تمام گوشوں میں قدرِ حریت اور شرفِ انسانیت کی وہ مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخِ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ (ریڈیو تقریر ۱۹۳۸ء)

قوانینِ الٰہیہ کا اتباع

جب تک اقوام کی خودی قانونِ الٰہی کی پابند نہ ہو۔ امنِ عالم کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی۔

(مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط ۱۹۳۶ء)

انحطاط کا جادو

انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے صید پر ایسا اثر ڈالتا ہے جس سے انحطاط کا محور اپنے قاتل کو اپنا مربی تصور کرنے لگ جاتا ہے۔ یہی حال اس وقت مسلمانوں کا ہے۔ (سراج الدین پال کے نام خط ۱۹۱۶ء)

ایرانی اثرات

ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام سے اور اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں۔ ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کروں جس کی اشاعت رسول اللہ صلعم سے ہوئی۔

(منشی سراج الدین کے نام خط ۱۹۱۵ء)

تصوّف

تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولیٹیکل انحطاط کے زمانہ میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی یہی چاہیئے تھا جس قوم میں توانائی مفقود ہو جائے۔ جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی تو قوم کا نقطۂ نگاہ بدل جاتا ہے۔ ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے اور ترکِ دنیا موجبِ تسکین۔ اس ترکِ دُنیا کے پردے میں قومیں اپنی سستی و کاہلی اور اس شکست کو جو ان کو تنازع للبقاء میں ہو، چھپایا کرتی ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھئے کہ ان کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔ (سراج الدین پال کے نام خط ۱۹۱۶ء)

تصوف کا وجود سرزمینِ اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی۔

(سید سلیمان ندوی کے نام خط ۱۹۱۷ء)

جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظامِ عالم کے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے۔ تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔

(علامہ اسلم جیراجپوری کے نام خط ۱۹۱۹ء)

ہندی اور ایرانی صوفیا میں سے اکثر نے مسئلہ فنا کی تفسیر فلسفۂ وحدانیت اور بدھ مت کے زیرِ اثر کی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارہ محض ہے۔ میرے عقیدے کی رو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔ اور ایک معنی میں میری تمام تحریریں اسی تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہے۔ (مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط ۱۹۳۶ء)

حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل و شعار میں باطنی معانی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دینا ہے۔ یہ ایک نہایت (SUBTLE) طریق تمسیخ کا ہے۔ اور یہ طریق وہی قومیں اختیار یا ایجاد کر سکتی ہیں جن کی فطرت گوسفندی ہو۔ شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعراء ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفہ کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلانِ طبع موجود تھا۔ اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصہ تک اس کا نشوونما نہ ہونے دیا تاہم وقت پاکر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح ظاہر ہوا۔ یا بالفاظ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بناء وحدت الوجود تھی۔ ان شعراء نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائرِ اسلام کی تردید و تمسیخ کی ہے اور اسلام کی ہر محسوس شے کو مذموم بیان کیا ہے۔ (سراج الدین پال کے نام خط۔ ۱۹۱۰ء)

ابنِ عربی

تصوف کا سب سے پہلا شاعر عراقی ہے جس نے لمعات میں فصوص الحکم محی الدین ابن عربی کی تعلیموں کو نظم کیا ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے فصوص میں سوائے الحاد و زندقہ کے اور کچھ نہیں۔ (سراج الدین پال کے نام خط۔ ۱۹۱۶ء)

خوئے غلامی

جب انسان میں خوئے غلامی راسخ ہو جاتی ہے تو وہ ہر ایسی تعلیم سے بیزاری کے بہانے تلاش کرتا ہے جس کا مقصد قوتِ نفس اور روحِ انسانی کا ترفع ہو۔ (مولوی ظفر احمد صاحب صدیقی کے نام خط۔ ۱۹۳۶ء)

قرآن کا مسلک

اگرچہ یورپ نے مجھے بدعت کا چسکا ڈال دیا ہے تاہم مسلک میرا وہی ہے جو قرآن کا ہے۔
(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۳۲ء)

شاعری

میرے زیرِ نظر حقائق اخلاقی دلتی ہیں۔ زبان میرے لئے ثانوی حیثیت رکھتی ہے، بلکہ فنِ شعر سے بھی بحیثیت فن کے نابلد ہوں۔ (پروفیسر شجاع کے نام خط۔ ۱۹۳۱ء)

شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کبھی میرا مطمحِ نظر نہیں رہا۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔ اس بات کو مدِ نظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور کریں۔
(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۱۹ء)

میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے میرا کوئی رقیب نہیں، اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فنِ شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں بعض مقاصدِ خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لئے ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے ورنہ ؎

نہ بینی خیر ازاں مردِ فرودست کہ بر من تہمتِ شعر و سخن بست

(سید سلیمان ندوی کے نام خط۔ ۱۹۳۷ء)

احتساب

(قسط ۷)

(احتساب کی چھٹی قسط، طلوعِ اسلام بابت جون ۱۹۷۹ء میں شائع ہو چکی ہے۔ اب اس سلسلہ کی اگلی کڑی ملاحظہ فرمائیے۔ یہ ۱۹۵۵ء کی داستان کا مسلسل حصہ ہے۔ قارئین نے اس سلسلہ کو اس قدر پسند کیا ہے کہ ان کا تقاضا ہے کہ اسے ایک کتابچہ کی شکل میں بھی شائع کیا جائے۔ کیونکہ یہ مملکتِ پاکستان کی تاریخ کا ایسا حصہ ہے جو اور کہیں نہیں مل سکتا۔ ہم ان کی اس تجویز پر بھی غور کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ تحریکِ پاکستان کی تاریخ .... طلوعِ اسلام کے دورِ اوّل کے فائلوں میں، اور مملکتِ پاکستان کی تاریخ اس کے موجودہ دَور کے فائلوں میں منضبط اور محفوظ ہے۔ اسے صرف مرتب کرنے کی ضرورت ہے..... بیدہ التوفیق۔)

(۰)

اُلٹی زقند

مشرقی پاکستان میں گورنری راج کا قیام اور مولوی فضل الحق (مرحوم) کی وزارت کا خاتمہ کرتے ہوئے اُس وقت کے وزیرِ اعظم پاکستان نے اعلان کیا تھا کہ مولوی صاحب غدّار ہیں۔ اور ایسے شخص کی وزارت کو قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ لیکن ۳ر جون ۱۹۵۵ء کو پارلیمانی زندگی بحال کرتے ہوئے اسی وزیرِ اعظم نے پھر مشرقی پاکستان کی حکومت کو فضل الحق گروپ کی تحویل میں دے دیا۔ محلاتی سازشوں کا یہ شاہکار ایک ایسی بے اصولی کا مظہر تھا، جسے گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اس پر:۔

"اے عقل چہ می گوئی۔ اے عشق چہ فرمائی؟"

کے عنوان سے طلوعِ اسلام نے لکھا:۔

۳ر جون کو وزیرِ اعظم محمد علی نے ڈھاکہ سے مشرقی پاکستان میں پارلیمانی احیاء کا اعلان کرتے ہوئے سارے ملک کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ اس سے، گستاخی معاف، یہ مترشح ہوتا ہے کہ انہیں نہ صوبے کا مفاد عزیز ہے نہ ملک کے مفاد کا پاس۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وزیرِ اعظم صاحب یہ تہیہ کر کے ڈھاکہ پہنچے تھے کہ اب کی بار نتائج و عواقب سے بے پرواہ ہو کر وہ مشرقی پاکستان کی جاگیر مولوی صاحب کو بخش دیں گے۔

یہ مولوی فضل الحق صاحب کون ہیں؟ ہم ان کے متعلق ذاتی معلومات کی بنا پر کچھ نہیں کہتے۔

گزشتہ سال ہمارے وزیرِ اعظم صاحب نے قائدِ اعظم کے فرمودات کا حوالہ دے کر یہ ثابت کیا تھا کہ مولوی صاحب "غدار" ہیں اور وہ اس قابل نہیں کہ انہیں وزیرِ اعظم رہنے دیا جائے۔ اُس وقت سے لے کر اب تک ملک بھر میں انتظار رہا کہ مولوی صاحب کے خلاف جو الزامات عائد کئے گئے ہیں ان کی تحقیق و تفتیش ہوگی۔ اور اگر ان کا جرم ثابت ہو گیا تو انہیں قرار واقعی سزا دی جائے گی۔ واضح رہے کہ کسی ملک میں غداری سے بڑھ کر کوئی اور جرم نہیں ہو سکتا۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا.....

لیکن اب اچانک یہ کیا ہو گیا کہ وزیرِ اعظم نے صوبہ بھر کی نہیں، ملک بھر کی قسمت کا سودا انہی مولوی صاحب سے کر لیا۔؟..... اگر وزیرِ اعظم نے اپنی ذاتی جاگیر کے متعلق اس قسم کے سودے کئے ہوتے تو ہم اس کے لئے کبھی لب کشائی نہ کرتے۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ پاکستان کسی کی جاگیر نہیں۔ اور کسی کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ اسے جسے جی چاہے یوں ہی بخش دے خواہ وہ غدار ہی کیوں نہ ہو۔ ہم وزیرِ اعظم صاحب سے استدعا کریں گے کہ اگر انہیں ان سیاسی روباہ بازیوں سے کبھی فرصت ملے تو وہ ذرا خلوت میں بیٹھ کر سوچیں کہ ان کے فیصلے کے نشتر کی زد کہاں تک پہنچتی ہے؟ یہ پارلیمانی احیاء نہیں بلکہ ملک کی بربادی کے سامان ہیں۔ اس ملک کی تباہی کے سامان جس کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ اسے جس کے سپرد جی چاہے کر دیا جاتا ہے اور وہ نخاس میں بکنے والے غلام کی طرح ساکت و صامت اور بیکس و بے بس کھڑا ہے اور ایک حرف بھی زبان پر نہیں لا سکتا۔ (طلوعِ اسلام بابت ۱۱ جون ۱۹۵۵ء صفحہ ۶)

پاکستان کی نئی دستوریہ

جون ۱۹۵۵ء میں نئی مجلسِ دستور ساز کا انتخاب عمل میں آیا۔ سیاسی پارٹیوں کے گٹھ جوڑ، محلاتی سازشوں اور شعبدہ بازیوں کی بدولت جس قسم کے نمائندے کامیاب ہو کر سامنے آئے ان کی اکثریت قطعاً اس منصبِ عظمیٰ کی اہل نہ تھی۔ اس صورتِ حال کا ماتم کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے، اپنی ۲ جولائی ۱۹۵۵ء کی اشاعت کے افتتاحیہ میں لکھا:-

آپ دیکھیں گے کہ ان افراد میں جو اب منتخب ہو کر آئے ہیں اور ان میں جو مرحوم مجلس کے اراکین تھے، دل و دماغ اور فکر و کردار کے اعتبار سے کوئی نمایاں فرق نہیں۔ لہٰذا جہاں تک آئین سازی کا تعلق ہے (ایک اسلامی مملکت کی آئین سازی کو تو چھوڑ دیجئے۔ عام مملکتوں کی آئین سازی کے نقطۂ نگاہ سے بھی) ان حضرات سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کرنا، اپنے آپ کو دھوکے میں رکھنا اور بالآخر مایوس ہونا ہے۔ آئین سازی اور جہاں بانی جیسے اہم فریضہ کی سرانجام دہی کے لئے ایسے افراد منتخب ہو کر آ گئے ہیں جو شاید اپنا نام لکھنا بھی نہ جانتے ہوں.....

> حقیقت یہ ہے کہ ہماری قوم اس قدر بانجھ نہیں ہوئی کہ اس میں صاحبانِ فکر و کردار کے پیدا کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رہی۔ قوم میں اچھے اچھے ذی استعداد لوگ موجود ہیں۔ لیکن پارٹی بازی کی میکیاولی ابلیسیت ان کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے اور جب تک یہاں ذہنی تبدیلی اور سیاسی شعور کی بیداری پیدا نہیں ہو جاتی آپ جتنے انتخابات جی چاہے کرا لیجئے نتیجہ ایک جیسا رہے گا۔ (صـ۳ـ)

یہ کچھ لکھنے کے بعد طلوعِ اسلام ان نمائندگانِ ملک کو ان کے ملکی و ملّی فریضہ پر متوجّہ کرتا ہے اور لکھتا ہے:۔

> اس کے باوجود ہماری ان حضرات سے پُرزور درخواست ہے (اور یہ درخواست قلب کی گہرائیوں سے اُبھر کر ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے صفحۂ قرطاس تک آئی ہے) کہ آپ کچھ وقت کے لئے خالی الذہن ہو کر سوچیں کہ وہ کس قدر اہم۔ عظیم۔ اور گراں قدر فریضہ ہے جسے آپ نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ اس وسیع و عریض مملکت کے استحکام و بقا اور اس میں بسنے والے سات آٹھ کروڑ نفوس کی زندگی اور سرفرازی کا مدار اس آئین پر ہے جس کی ترتیب و تدوین کا بارِ گراں آپ نے از خود اپنے کندھوں پر اُٹھایا ہے۔ اگر آپ نے اپنی اس ذمہ داری کا صحیح صحیح احساس کیا تو اس سے نہ صرف ملّتِ پاکستانیہ کی موجودہ نسل آپ کی زیر بارِ احسان ہوگی بلکہ آنے والی نسلیں بھی، جو آپ کے لگائے ہوئے شجرِ طیّب کے سائے تلے بیٹھ کر آرام کریں گی اور اس کے حسین و شاداب پھل کھائیں گی، آپ کو ہمیشہ ہمیشہ دعائیں دیتی رہیں گی۔ (ایضاً)

نئی دستوریہ کے کھیل تماشے

نئی دستوریہ کے قیام کے بعد حکومت نے ضروری سمجھا کہ اس مجلس کے اہم کام کو جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اس کے اجلاس کا انتظام مری کی پُر فضا اور پُرسکون بلندیوں پر کیا جائے۔ اس کے لئے مری کے کلب ہال میں ضروری انتظامات کئے گئے۔ کراچی سے فرنیچر وغیرہ منگوانے پر الگ بے پناہ رقوم خرچ ہوئیں۔ لیکن مجلس نے اپنے تین ہی دنوں کی ہنگامہ آرائیوں کے بعد اس اجلاس کے غیر معیّن التواء کا فیصلہ کر دیا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی طے کر دیا کہ آیندہ سے مجلس دستور ساز کے اجلاس کراچی میں ہوں۔ مملکت کے نمائندوں کی یہ مضحکہ خیزیاں اس قدر ناقابلِ برداشت تھیں کہ طلوعِ اسلام نے "تماشا گاہِ مری" کے عنوان سے ان کھیل تماشوں کی پُرزور مذمت کرتے ہوئے لکھا:۔

> کوئی غایت درجہ کا شقی ہوگا جو یہ یقین کرے گا کہ یہ قوم کے وہ فرزند ہیں جنہیں قوم نے اس لئے منتخب کر کے یہاں بھیجا ہے کہ یہ اس اہم فریضہ کو سرانجام دیں جو آٹھ سال تک سرانجام نہیں دیا جا سکا اور جس کے بغیر ان کا ملک سرزمینِ بلے آئین کہلا رہا ہے۔ کیفیتِ کار سے صرف نظر کر کے اگر ہم محض کمیتِ کار کو دیکھیں تو بھی بارِ ندامت سے سر جھک جاتا ہے۔۔۔۔ چار

اجلاس منعقد کر کے مری کو خیرباد کہہ دینا غایت درجہ کی معاملہ نافہمی اور بداندیشی ہے۔ اگر مری کا انتخاب صحیح تھا اور وہ جگہ کام کے لئے موزوں تر تھی تو اس کے بدلنے کی کوئی وجہ نہ ہونی چاہیئے تھی۔ اور اگر یہ انتخاب غلط تھا تو حکومت کے تبدیلی کے مطالبے کے باوجود جو ضد کی وہ ناقابلِ فہم اور درخورِ مذمت ہے۔ ...... اگر حکومت کو مری کلب کی سرپرستی مقصود تھی تو اسے عطیہ دیا جا سکتا تھا۔ اگر ارکانِ دستوریہ کو مری کی سیر کرانے کا شوق تھا تو اس کے لئے دوسری صورتیں بھی پیدا کی جا سکتی تھیں۔ لیکن یہ کیا ضرور تھا کہ ملک اور قوم سے مذاق کیا جائے۔ اس ضیاع اور زیان کے لئے ہم تنہا حکومت کو ذمہ دار قرار نہیں دیتے۔ اس جرم میں ارکان مجلسِ دستورساز بھی شریک ہیں جو مواخذہ سے ہرگز نہیں بچ سکتے۔

سطورِ بالا میں ان امور کی طرف توجہ دلانے سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ اب بھی اس گھناؤنے کھیل کو ختم کیا جا سکتا اور کامل توجہ سے پیشِ نظر کام کو نبٹایا جا سکتا ہے۔ اگر کراچی میں بھی یہی داستان دہرائی گئی تو جدید مجلس دستورساز بھی سابقہ مجلس سے بہتر سلوک کی مستحق نہیں رہے گی۔ اور اس کا ٹھکانہ بھی اسی قبرستان میں ہوگا۔ جہاں اس کی پیشرو کا مدفن ہے۔ کس قدر سوختہ بخت ہے یہ ملک اور کتنے بے نصیب ہیں اس ملک کے رہنے والے! ان واقعات سے بار بار یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جس ملک کے سیاسی شعور اور قومی کردار کا یہ عالم ہو اُسے جمہوریت راس آ ہی نہیں سکتی۔

(شمارہ ۱۶ر جولائی ۱۹۵۵ء - صفحہ ۴-۵)

۳ر ستمبر ۱۹۵۵ء کی (ہفت روزہ) اشاعت میں طلوعِ اسلام کو پھر یہی تلخ اور جگرسوز موضوع چھیڑنا پڑا۔ "ہمارے لیڈر" کے عنوان سے اس نے مجلسِ دستورساز کے اراکین کی فتنہ انگیز روش کا محاسبہ کرتے ہوئے لکھا:-

قوم کو بددلی کے جہنم میں دھکیل کر اربابِ سیاست ملک کے مفاد سے جو کھیل کھیل رہے ہیں، اس کی بدترین مثال جدید مجلس دستورساز کی کارگزاری ہے ...... اور یہ کچھ کرنے والے کون ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں قوم نے اس لئے منتخب کیا ہے کہ وہ ملک کے لئے کم سے کم وقت میں آئین وضع کریں۔ کیونکہ سات طویل سالوں میں آئین مرتب نہ ہو سکنے کی وجہ سے قومی معاملات میں گوناگوں پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں اور ملک ایک عظیم بحران سے دوچار ہو گیا ہے۔ اگر گذشتہ دو ماہ کی کارگزاری کو دیکھا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مجلسِ دستورساز عمر بھر اپنا فریضۂ منصبی ادا نہیں کر سکے گی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوگا کہ ان نام نہاد آئین سازوں پر سے ملک کا اعتماد ختم ہو جائے گا۔ اور عام بددلی پھیلے گی۔ اور دوسرا یہ کہ ملک کا کوئی مسئلہ طے نہیں ہوگا۔ اس سے بددلی کو اور تقویت پہنچے گی۔ پاکستان آج اسی عذاب میں مبتلا ہے اور اس کی ذمہ داری اربابِ سیاست پر ہے، خواہ وہ حکومت کی کرسیوں

پر متمکن ہوں یا محرومین کے گروہ میں شامل۔ ان حالات میں ملک کا سب سے بڑا محسن وہ ہوگا جو اسے اس دلدل سے نکال کر لے جائے ــــ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس چمن میں کوئی ایسا دیدہ ور ہے یا نہیں۔

(۰)

وحدتِ مغربی پاکستان کی خود غرضانہ مخالفت

۲۳ اگست ۱۹۵۵ء کو مغربی پاکستان کی وحدت (ONE UNIT) کا مسودہ دستور ساز اسمبلی میں پیش ہوا اور دنیا نے یہ عجیب تماشا دیکھا کہ اس سے قبل، جن قومی نمائندوں نے پنجاب، سرحد اور سندھ کی اسمبلیوں میں اس تجویز کو خود منظور کرایا تھا، وہی اب اس کی مخالفت میں دھواں دھار تقریریں کر رہے تھے۔ ایسا کیوں ہو رہا تھا۔ اس کی وضاحت اور اس ذہنیت کا ماتم کرتے ہوئے "طلوعِ اسلام" نے ۱۷ ستمبر ۱۹۵۵ء کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھا:۔

اب تک کم و بیش تیس ارکان (دستور ساز اسمبلی میں) اس کے متعلق تقریریں کر چکے ہیں۔ ان میں خاصی تعداد حزبِ مخالف کی بھی ہے۔ آپ ان تقریروں کو دیکھئے اور پھر غور کیجئے کہ ان میں کوئی اختلاف بھی اصول پر مبنی ہے؟ صاف نظر آتا ہے کہ چند ذاتی مخاصمتیں ہیں جو تجویز کی مخالفت میں اُبھر اُبھر کر سامنے آ رہی ہیں۔ اور سامنے بھی اس سوقیانہ انداز سے آ رہی ہیں جس سے خود جمہوریت کی آنکھیں نیچی ہو کر جائیں۔ ۲۳ اگست سے اس وقت تک کا عرصہ اسی ایک مسئلہ کی نذر ہو گیا۔ اگر اس تجویز کو رائے عامہ کے لئے مشتہر نہ کیا گیا تو پھر اس مسودہ پر "شق بہ شق" بحث ہوگی۔ یہ بحث کس قدر طول پکڑے گی، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک شق کے ساتھ سینکڑوں ترمیمات نتھی کر دی گئی ہیں۔ ہم تو سمجھ ہی نہیں سکتے کہ اس انداز اور اس رفتار سے یہ مجلس، دستور سازی کے معاملہ میں کیا کام کر سکے گی۔ ملک اس پر رو رہا ہے کہ سابقہ دستوریہ نے سات سال ضائع کر دیئے۔ لیکن اگر لیل و نہار یہی ہیں تو یہ دستوریہ ستر سال میں بھی دستور مرتب نہیں کر سکے گی۔

(طلوعِ اسلام ۱۷ ستمبر ۱۹۵۵ء صفحہ ۷)

مغربی پاکستان کی وحدت ضروری کیوں؟

اس افتتاحیہ کے آخر میں طلوعِ اسلام نے اس امر کی وضاحت کی کہ وحدتِ مغربی پاکستان کی عملی تشکیل اس کے نزدیک کیوں ضروری ہے۔ اس سلسلے میں اس نے بتایا کہ:۔

مغربی پاکستان کی وحدت کے لئے ہماری تائید اور کوشش محض اس لئے ہے کہ ہم قرآنی بصیرت کی روشنی میں سمجھتے ہیں کہ یہ اقدام وحدتِ ملت کے لئے بڑا سازگار رہے گا۔ اور اس سے قرآنی نظامِ ربوبیت کے قیام کا راستہ نسبتاً آسان ہو جائے گا۔ باقی رہا بعض صوبوں کا یہ

خدشہ کہ اس سے ان کا کلچر مٹ جائے گا تو ہمارے ہاں جس قدر بھی مروجہ کلچر ہیں، ان میں کوئی بھی اسلامی نہیں۔ لہٰذا بجائے اس کے کہ ہم ان غیر اسلامی کلچرز کے تحفظ کی فکر کرتے رہیں ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ یہ جلد از جلد مٹ جائیں اور ان کی جگہ ایک نیا کلچر وجود میں آجائے جو خالص قرآنی خطوط پر متشکل ہو اور ہم اپنی آنے والی نسلوں کو لات و منات کہنہ کا روایتی کلچر ورثہ میں دینے کی بجائے ان کے لئے نو متشکل قرآنی کلچر ترکہ میں چھوڑیں۔ ارباب بصیرت سے ہماری درخواست یہ ہے کہ وہ سرحدی۔ پنجابی اور سندھی تصورات زندگی اور روایتی ثقافت کے خیال کو چھوڑ دیں اور اللہ نے ہمیں جو ایک موقع فراہم کیا ہے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک متحدہ اور جامع اسلامی تصور حیات اور قرآنی ثقافت کی طرح ڈالیں ؎

وقت آنست کہ آئین دگر تازہ کنیم
لوح دل پاک بشوئیم و زسر تازہ کنیم

(۰)

مخلوط انتخاب کا شاخسانہ

اسی دوران میں، جداگانہ انتخاب اور مخلوط انتخاب کا شاخسانہ چھیڑ دیا گیا۔ پاکستان، دو قومی نظریہ کی بنا پر حاصل کیا گیا تھا جس کا فطری اور لازمی نتیجہ، جداگانہ انتخاب تھا۔ اسی اعتبار سے مخلوط انتخاب کا نظریہ، مملکت پاکستان کی بنیادوں تک کو متزلزل کر دینا تھا۔ طلوع اسلام نے اس کا خاص طور پر نوٹس لیا اور اپنی ۱۹ نومبر ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں اس پر ایک بھرپور اداریہ سپرد قلم کیا۔ اس میں دو قومی نظریہ کی سیاسی ہی نہیں بلکہ دینی حیثیت پر بڑی تفصیلی بحث کرتے ہوئے لکھا:۔

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان ذہنوں کے متعلق کیا کہا جائے، جن میں مخلوط انتخاب کا یہ باطل افروز تصور پیدا ہوا۔ ان زبانوں کے متعلق کن الفاظ میں گفتگو کی جائے جنہوں نے اس اسلام سوز فتنے کو آگے پھیلایا اور ان ہاتھوں کا ذکر کس انداز سے کیا جائے جو اس زہر آلود خنجر کو سینۂ ملت میں پیوست کرنے کے لئے یوں بے باکانہ اٹھ رہے ہیں۔ (شمارہ ۱۹ نومبر ۱۹۵۵ء ص۳)

اس کے بعد قومیت کے اسلامی تصور کی تفصیلات پیش کرتے ہوئے قرآن اور تاریخ دین کی روشنی میں طلوع اسلام نے واضح کیا کہ اسلام میں قومیت کا مدار آئیڈیالوجی کے اشتراک پر ہے۔ وطن۔ رنگ یا نسل وغیرہ کی اساس پر ہرگز نہیں۔ افتتاحیہ کے آخر میں اس نے اراکین دستوریہ اور کارفرمایان مملکت کو بایں الفاظ متنبہ کیا۔

..... اگر دستور میں مخلوط انتخاب جیسے غیر اسلامی تصور کو ملبوس دیا گیا تو ہم واضح الفاظ میں کہہ دینا چاہتے ہیں کہ یہ روش زیادہ عرصہ تک نہیں چل سکے گی ..... اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کے اصولوں سے انحراف کے باوجود جس دستور یہ کو آپ اسلامی کہہ کر مرتب کریں گے قوم اسے اسلامی سمجھ کر سر آنکھوں سے لگا لے گی تو یہ آپ کی بھول ہے۔ (ایضاً ص۵)

(۰)

پروفیسر رفیع اللہ شہاب

سلطان اورنگ زیب عالمگیر اور ــــــ شرعی حدود کا نفاذ

برصغیر ہند و پاکستان کے مسلم دورِ حکومت کے بارے میں عام طور پر یہ تصور پایا جاتا ہے کہ جملہ مسلمان بادشاہوں کی بہ نسبت سلطان اورنگ زیب عالمگیر نے شرعی حدود کو سختی سے نافذ کیا تھا۔ اس تصور کی بڑی وجہ یہ ہے کہ سلطان موصوف نے اپنے وقت کے پانچ صد جید علماء کو جمع کر کے حنفی فقہ کے مطابق اسلامی قانون کی تدوین کرائی تھی۔ یہ کوشش فتاویٰ عالمگیری کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی۔ جس کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ سلطان نے ایک فرمان کے ذریعے اسے اسلامی ہند کے طول و عرض میں نافذ کر دیا تھا۔

سلطان اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے دورِ حکومت میں جو متعدد فرامین جاری کئے تھے ان کا پورا ریکارڈ تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے۔ اس لئے راقم کے دل میں یہ تجسس پیدا ہوا کہ فتاویٰ عالمگیری کو نافذ کرنے والے فرمان کی اصل عبارت کا مطالعہ کیا جائے۔ یہ فرمان تو مجھے کہیں سے بھی نہ مل سکا۔ البتہ اس کوشش کے دوران شرعی حدود کے نفاذ کے بارے میں ان کے کچھ دوسرے فرامین نظر سے گذرے جن سے یہ دلچسپ حقیقت سامنے آئی کہ سلطان موصوف شرعی احکامات کے نفاذ کے سلسلے میں فقہ کی کتابوں میں متعین کردہ شرعی سزاؤں کے بجائے قرآنِ مجید پر زیادہ انحصار کرتے تھے۔ یہ بات تو تاریخی طور پر ثابت ہے کہ سلطان موصوف کو مملکت کے انتظام و انصرام کے بعد جو تھوڑا بہت وقت ملتا تھا وہ اُسے قرآنِ کریم کی خدمت میں صرف کیا کرتے تھے، لیکن ان کے فرامین پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کتابِ مقدس پر غور و فکر بھی کرتے رہتے تھے اور فقہ کے مقابلے میں جن قرآنی احکامات کے بارے میں ان کا اطمینان ہو جاتا تھا انہیں نافذ بھی کر دیتے تھے۔ اس کی وضاحت کے لئے ہم چوری کی سزا نافذ کرنے کے بارے میں ان کا ایک فرمان قارئین تک پہنچانے کی مسرت حاصل کرتے ہیں۔

یہ تو معلوم ہے کہ فقہ کی کتابوں میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا بیان کی گئی ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ "ہاتھ" کی شرعی تعریف میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان میں انگلیوں سے لے کر بازو تک "ید" کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس لئے جہاں اکثر فقہا کے نزدیک پہنچے سے ہاتھ کاٹا جانا چاہیئے، خوارج پورا بازو کاٹنے کا مشورہ دیتے تھے۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے استاد امام نخعیؒ۔ امام ابن شبرمہؒ۔ امام ابن ابی لیلیٰؒ۔ خواجہ حسن البصریؒ اور حضرت عمرؓ صرف پانچ انگلیوں کے کاٹنے کو کافی سمجھتے تھے۔ (نیل الاوطار جلد ہفتم صـــ۱۳۳) اور فقہ جعفریہ کا یہ مشہور مسئلہ ہے کہ صرف چار انگلیاں ہی کاٹی جانی چاہئیں لیکن سلطان اورنگ زیب عالمگیر نے اپنی مملکت میں چوری کی جو سزا نافذ کی وہ ان سب سے مختلف تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے جو

فرمان جاری کیا اس کے اصل الفاظ یہ ہیں:۔

اوّل شخصے کہ بُرا دُ سرقتہ نزدِ قاضی بہ ثبوتِ شرعی بر سد، بہ اقرار یا بہ بیّنہ بشرائطِ اقامتِ حد بودہ، محبوس سازد، تا اثر توبۂ دزدی ظاہر شود۔

(نقل فرمانِ عدالت عنوان مشتمل بر سی و سہ فصل فرمان اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ مرأتِ احمدی۔ جزو اوّل۔ مصنف مرزا محمد حسن۔ مطبوعہ کلکتہ ۱۹۲۸ء۔ صفحہ ۲۷۸)

(ترجمہ)۔ ایسا شخص جس پر شرعی ثبوت کے ذریعے قاضی کے نزدیک چوری کا جرم ثابت ہو جائے، چاہے اس کے اپنے اقرار سے یا اقامتِ حد کے لئے جو شرائط ہیں ان کی شہادت کے ذریعے۔ تو اسے قید کر دیا جائے یہاں تک کہ وہ چوری سے توبہ کر لے۔

آج سے چالیس سال پہلے ہمارے علمی رسائل میں اس موضوع پر بحث چلی تھی جس میں کسی نے امام ابو مسلمؒ اصفہانی کے حوالے سے بیان کیا تھا کہ قرآن میں چوری کی سزا قید مقرر کی گئی ہے۔ اور شریعتِ ابراہیمؑ کے ایک نبی، حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کے درمیان چوری کی سزا کے سلسلے میں اس کا بیان ہوا ہے۔ جب ان کے چھوٹے بھائی کی بوری سے سرکاری پیالہ برآمد ہوا جس کی چوری کے شبہ میں ان کے مال کی تلاشی لی گئی تھی۔ تو حضرت یوسف علیہ السلام نے ان سے ان کی شریعت میں چوری کی سزا کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے یہ جواب دیا تھا:۔

قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِیْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِی الظّٰلِمِیْنَ ۔ (سورۂ الیوسف۔ آیت ۷۵)

انہوں نے کہا کہ جس کی بوری سے یہ (پیمانہ) ملے۔ یعنی اس پر چوری کا جرم ثابت ہو جائے تو وہی اس کی سزا ہے۔ اس طرح ہماری شریعت میں ظالموں کو سزا دی جاتی ہے۔

ابو مسلم کی چودہ جلدوں میں قرآنی تفسیر کو تو مخالفین نے ضائع کر دیا تھا۔ لیکن ان کے جو اقوال دوسری تفاسیر میں کہیں نہ کہیں نقل ہو چکے ہیں قرآن فہمی کے سلسلہ میں سرمایۂ بصیرت ہیں۔

سوچنے کی بات، یہ ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر نے پانچ صد جید علماء سے فتاویٰ عالمگیری مرتب کرانے کے باوجود اس کتاب میں درج شدہ چوری کی سزا نافذ کرنے کے بجائے، اس جرم کی وہ سزا نافذ کی جو ان کے خیال کے مطابق قرآن سے ثابت ہوتی تھی۔ اور پھر تعجب کی بات یہ ہے کہ ان پانچ صد جید علماء میں سے کسی نے ان پر اعتراض نہیں کیا۔ موجودہ دور کے علماء کے لئے اس میں غور و فکر کا کافی سامان ہے۔

خریداران پرچہ نہ ملنے کی اطلاع ہر ماہ کی پندرہ تاریخ سے پہلے دیا کریں تاکہ پرچہ دوبارہ بھیج دیا جائے۔